سلسلۂ اشاعتِ تنظیمِ اسلامی نمبر ۱۰

مروجہ تصوف یا سلوکِ محمدیؐ؟

یعنی

احسانِ اسلام!

☆

ڈاکٹر اسرار احمد

تنظیمِ اسلامی

مرکزی دفتر: A-67 علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور

فون: 36293939, 36366638 فیکس 36271241

www.tanzeem.org

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا﴾ (النساء:۱۲۵)

”اور اُس شخص سے بہتر کس کا دین ہو سکتا ہے جو اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے درآنحالیکہ وہ خوب کار (احسان کرنے والا) بھی ہو اور ابراہیمؑ کی ملت کی پیروی کرے جو بالکل یکسو تھا!“

☆☆☆

عن ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ عنہ قال قال رسول اللّٰہ ﷺ :

((اِذَا اَحْسَنَ اَحَدُكُمْ اِسْلَامَهٗ فَكُلُّ حَسَنَةٍ يَعْمَلُهَا تُكْتَبُ لَهٗ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ ، وَكُلُّ سَيِّئَةٍ يَعْمَلُهَا تُكْتَبُ بِمِثْلِهَا حَتّٰى لَقِيَ اللّٰهَ)) (متفق علیہ)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”جب تم میں سے کوئی اپنے اسلام کو بہترین بنا لے (یعنی جس کا اسلام درجۂ احسان تک پہنچ جائے) تو پھر وہ جو نیکی بھی کرے گا تو (اس کے بدلہ میں) اس کے نامۂ اعمال میں ایسی دس نیکیوں سے لے کر سات سو گنا تک (اجر و ثواب) لکھا جائے گا‘ اور جب وہ کسی برائی کا مرتکب ہو گا تو اُس کے نامۂ اعمال میں اسی کے برابر (گناہ) لکھا جائے گا‘ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حضور حاضر ہو جائے گا“۔

وعنہ قال قال رسول اللّٰہ ﷺ :

((مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهٗ مَا لَا يَعْنِيْهِ)) (سنن الترمذی)

اور حضرت ابوہریرہؓ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”کسی شخص کے اسلام کے حُسن کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ فضول اور غیر متعلقہ اُمور کو ترک کر دے“۔

حقیقتِ تصوف

ذیلی عنوانات

- تصوف کا موضوع اور اس کے مقاصد 4
- ''تصوف'' کی اصطلاح اور اس کا ماخذ 5
- پہاڑ جیسی غلطی کے ہولناک نتائج 8
  (i) کتاب و سنت کی اہم اصطلاح سے محجوبیت 8
  (ii) کتاب و سنت کے شیدائیوں میں تصوف سے بعد 10
- تصوف کا منصوص و مسنون طریق 12
- انسانی شخصیت کے ارتقاء کے دو پہلو 14
- روح کی تقویت کا ذریعہ: ذکر الٰہی 15
- حصول ایمان کے ذرائع 17
- ذکر الٰہی کے ضمن میں قرآن کا مقام 19
- ''تحریر الروح'' کا منطقی نتیجہ 20
- تہذیب و تزکیہ نفس کے ذرائع 21
- سلوک محمدیؐ سے انحراف کے اسباب 25
  (i) قرآن حکیم سے بُعد 25
  (ii) جہاد سے دوری 30
- علاج اس کا......؟ 32

الحمدللہ و کفی، والصلوۃ والسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ، خصوصًا علیٰ افضلھم وخاتمِ النبیین محمدٍ الامین وعلیٰ آلہٖ وصحبہ اجمعین...... اما بعد فقد قال اللہ تبارك وتعالیٰ کما ورد فی سورۃ المائدۃ:

لَیۡسَ عَلَی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِیۡمَا طَعِمُوۡۤا اِذَا مَا اتَّقَوۡا وَّاٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوۡا وَّاٰمَنُوۡا ثُمَّ اتَّقَوۡا وَّاَحۡسَنُوۡا ؕ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ (۹۳)

صدق اللہ العظیم ...... رب اشرح لی صدری ویسرلی امری واحلل عقدۃ من لسانی یفقھوا قولی۔ اللھم ربنا الھمنا رشدنا واعذنا من شرور انفسنا۔ اللھم ارنا الحق حقًا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلًا وارزقنا اجتنابہ۔ اللھم نور قلوبنا بالایمان واشرح صدورنا للاسلام۔ اللھم وفقنا لما تحب وترضی۔ اللھم ربنا زدنا ایمانا وھدی وعلما نافعا وعملًا صالحا متقبلا۔ اللھم ربنا اجعلنا من عبادك المخلصین وعبادك المحسنین۔ آمین یا رب العالمین!

مسائل حکمت کے ضمن میں ہمارے آج کے موضوع کا جامع عنوان ''تصوف'' ہے۔ اور اس ضمن میں خاص طور پر یہ کہ اس کا سنّتِ رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے انحراف کس نوعیت کا تھا اور کیوں ہوا؟ چونکہ یہ موضوع بہت طویل ہے، اس لیے میں تمہید میں کوئی وقت ضائع کئے بغیر براہ راست گفتگو کا آغاز کر رہا ہوں اور کوشش کروں گا کہ تکرار اور اعادے کی ضرورت کم سے کم پیش آئے۔

تصوف کا موضوع اور اس کے مقاصد

پہلی بات یہ کہ تصوف کا موضوع اور مقصد کیا ہے؟ اس کے ضمن میں پہلا مشاہدہ (Observation) یہ ہے کہ تصوف کا موضوع اور مقاصد صد فی صد درست اور خالص اسلامی ہیں۔ اگر ہم انہیں معیّن الفاظ کا جامہ پہنائیں تو وہ یہ ہیں:

اولاً، جہل سے نجات اور معرفت کا حصول۔

ثانیًا، تہذیب وتزکیۂ نفس (تہذیب=مہذّب بنانا۔ہم نے دسویں جماعت میں ایک عربی شعر پڑھا تھا جس میں یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں:"رَبُّوا اَبنِیکم عَلِّموھم، هَذِّبُوا فِتيَاتِكم" اولاد کے لئے تعلیم کے ساتھ ہی تہذیب کا لفظ آتا ہے۔)

ثالثًا، تصفیۂ قلب اور تجلیۂ روح (یعنی روح کو جلا دینا اور اسے انوارِ الٰہی سے منور کرنا) اس ضمن میں میرے استاد مرحوم مولانا منتخب الحق قادری رحمہ اللہ نے ابن سینا کا ایک جملہ سنایا تھا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تجلیاتِ ربانی سے تمہیں کوئی حصہ ملے تو "فَجَاهِدفِي خَلَوَاتِكَ"۔ اپنی خلوتوں میں مجاہدے کرو، مراقبے کرو "فَلَعَلَّ شَعْشَعَةً تَلمعُ لك" تو شاید کبھی تجلّیٔ خداوندی کی کوئی شعاع تمہارے لئے بھی چمک اٹھے۔

رابعًا، خالق سے خلوص واخلاص (اور دنیا ومافیہا سے بے رغبتی)......اور

خامسًا، مخلوق کی خدمت۔ شیخ سعدیؒ کا بہت پیارا شعر ہے ۔

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست
بتسبیح و سجادہ و دَلق نیست

یعنی طریقت تو صرف خدمتِ خلق کا نام ہے، سوائے خدمتِ خلق کے طریقت کی کوئی حقیقت نہیں۔ ہاتھ میں تسبیح ہو، جائے نماز کندھے پر ہو اور دلق یعنی گدڑی اوڑھی ہوئی یہ تصوف اور طریقت نہیں ہے، بلکہ طریقت تو نام ہے خدمت خلق کا۔ اب ظاہر ہے کہ یہ تمام مقاصد دین ہی کے مقاصد ہیں، جو مطلوب ہیں۔ لہٰذا جہاں تک تصوف کے مقاصد اور تصوف کے موضوع کا تعلق ہے وہ عین دین ہے اور وہ عین مطلوب ہے۔

"تصوف" کی اصطلاح اور اس کا ماخذ

لیکن اس کے ضمن میں پہلی ہمالیہ جیسی غلطی اس کے لئے خالص "غیر قرآنی" ہی نہیں بلکہ ایک "مجہول الاصل" عنوان کا اختیار کر لیا جانا ہے۔ یہ دو الفاظ نوٹ کر لیجئے۔ ایک تو یہ لفظ غیر قرآنی ہے۔ لفظ تصوف کا کوئی تعلق نہ قرآن سے ہے نہ سنت اور حدیث سے۔ دوسرے یہ کہ یہ لفظ مجہول الاصل بھی ہے، جس کا مادہ ہی متفق علیہ نہیں۔ اس کے بارے میں

پہلی بات یہ نوٹ کر لیجئے کہ یہ لفظ دوسری صدی ہجری کے اختتام کے قریب استعمال ہونا شروع ہوا۔ ڈاکٹر میر ولی الدین نے تو اس کیلئے باقاعدہ سن معین کیا ہے، ۸۲۲عیسوی۔ حضورﷺ کا انتقال ۶۳۲ء میں ہوا، اور ہجرت ۶۲۲ء میں ہوئی، تو حضورﷺ کے انتقال کے ۱۹۰برس بعد، بلکہ قمری تقویم کے اعتبار سے ۱۹۶برس بعد، یہ لفظ ایجاد ہوا ہے۔

دوسری بات یہ نوٹ کیجئے کہ اس کے ماخذ کے بارے میں جو چار آراء رہی ہیں کہ یہ لفظ عربی کے کس مادے سے اخذ کیا گیا ہے۔ ان میں سے تین تو بالکل غلط ہیں اور ان کا غلط ہونا صدفی صد ثابت ہے۔ چنانچہ ایک رائے یہ ہے کہ یہ لفظ "صَفا" سے بنا ہے، حالانکہ صرف ونحو کے کسی قاعدے کی رو سے "صفا" سے "صُوفی" کا لفظ نہیں بن سکتا بلکہ اس سے "صَفَوِی" بنے گا، جیسے خاندانِ صفوی۔ دوسری رائے یہ ہے کہ تصوف کا لفظ "صَف" سے بنا ہے، لیکن یہ اس سے بھی ہرگز نہیں بن سکتا۔ "صف" کے ساتھ یائے نسبت کا اضافہ کریں تو "صَفّی" بنے گا نہ کہ "صوفی"۔ تیسری رائے یہ کہ یہ "صُفّہ" سے بنا ہے، وہ بھی غلط ہے، کیونکہ صُفّہ سے "صُفّی" بنتا ہے، صوفی نہیں۔ ڈاکٹر میر ولی الدین ان لوگوں میں سے ہیں جو قدیم اور جدید دونوں کے عالم ہیں۔ ان کی فلسفے میں ڈاکٹریٹ تھی اور اسلامی تصوف پر ان کی متعدد کتابیں ہیں۔ ان کی ایک تصنیف قرآنی تصوف پر ہے جس میں انہوں نے تسلیم کیا ہے کہ یہ تینوں باتیں بے بنیاد ہیں۔

البتہ ایک رائے یہ ہے کہ اس کا مصدر یا مادہ لفظ "صُوف" ہے اور عام طور پر یہی بات مانی جاتی ہے اور اکثر لوگوں کی رائے یہی ہے کہ یہ "صُوف" ہی سے بنا ہے۔ اس ضمن میں اپنی رائے میں بعد میں بیان کروں گا، لیکن یہ بات ایک درجے میں قابل قبول ضرور ہے۔ گرائمر میں صوف سے صوفی بن جاتا ہے۔ اس اشتقاق کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ یہ اللہ والے حضرات تھے، جن کی زیادہ توجہ دنیا کی بجائے اللہ کی طرف تھی، ان میں دنیا ومافیہا سے بے رغبتی تھی، اللہ کے ساتھ خلوص واخلاص تھا اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ معرفت کے حامل تھے، جنہوں نے تہذیبِ نفس، تصفیۂ قلب اور تجلیۂ روح کی منزلیں طے کی تھیں، جن میں

درویشی تھی، یہ حضرات اون کا لباس پہنا کرتے تھے جس کے نیچے کوئی اور لباس نہیں ہوتا تھا، تاکہ اس کے ذریعے چبھن اور بے آرامی کا احساس ہوتا رہے۔ یعنی آرام کی بجائے سختی کی عادت پڑے۔ چنانچہ یہی الفاظ اقبال نے اپنے اس شعر میں استعمال کیا ہے ۔

صوفیٔ پشمینہ پوشِ حال مست
از شرابِ نغمۂ قوال مست

تو یہ لوگ اون کا کھردرا لباس پہنتے تاکہ اندر سے بال کاٹتے رہیں اور اس طرح ان کے نفس کو استراحت کے بجائے تکلیف اور کوفت کا احساس ہوتا رہے۔ اس رائے پر تقریباً اجماع ہے اور یہ لغت کے اعتبار سے بھی صحیح ہے۔

اس ضمن میں میری ذاتی رائے مختلف ہے اور اپنے علم کی حد تک میں اس رائے میں منفرد ہوں ۔ میرے نزدیک لفظ ''تصوف'' کا ماخذ یونانی لفظ ''Sophia'' ہے جو بعض علوم کے ساتھ لاحقے کے طور پر آتا ہے۔ مثلاً Philosophy۔ یونانی زبان میں sophia کا معنی ہے wisdom یعنی حکم و دانائی، اور sophos حکیم و دانا (wise) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لفظ تصوف درحقیقت Theosophy سے بنا ہے جو عرفان و معرفتِ خداوندی کا علم ہے theo کا لفظ یونانی زبان میں مذہبی معاملات کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی سے Theocracy کی اصطلاح بنی ہے جو مذہبی لوگوں کی حکومت کیلئے استعمال ہوتی ہے اور میں نے بارہا کہا ہے کہ میں اس ضمن میں مولانا مودودی مرحوم کی رائے کو بالکل صحیح سمجھتا ہوں کہ اسلامی ریاست نہ تھیوکریسی ہے اور نہ ڈیموکریسی، بلکہ یہ ایک ''تھیوڈیموکریسی'' ہے، کیونکہ اس میں "Theo" اور "demo" دونوں عنصر جمع ہیں۔ بالکل اسی طرح کا معاملہ theosophy کا بھی ہے۔ چنانچہ یہ لفظ آج بھی استعمال ہوتا ہے، اور درحقیقت تصوف کا لفظ یہیں سے آیا ہے۔ اور یہ بات ہر شخص کے علم میں ہے کہ دوسری صدی ہجری کے دوران یونانی فلسفہ اور نو افلاطونی تصوف کا ایک بہت بڑا سیلاب عالم اسلام پر آ چکا تھا۔ لفظ تصوف کے اشتقاق کے بارے میں یہ میری ذاتی رائے

ہے، کوئی اسے قبول کرنا چاہے تو کرے، نہ کرنا چاہے تو رد کر دے۔ بہر حال اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ تصوف کی اصطلاح مجہول الاصل ہے۔

پہاڑ جیسی غلطی کے ہولناک نتائج

i) کتاب وسنت کی اہم اصطلاح سے محجوبیت: اس ہمالیہ جیسی غلطی کے جو ہولناک نتائج نکلے، ان میں سے اولین یہ ہے کہ کتاب وسنت کی اہم صطلاح ''احسان'' سے محجوبیت اور محرومی ہوگئی اور اب ہمیں لفظ احسان کے صرف ایک ہی معنی معلوم رہ گئے ہیں یعنی کسی سے حسن سلوک کرنا، کسی سے بھلائی کرنا۔ اگرچہ اس لفظ کے یہ معنی بھی ہیں، چنانچہ اسی معنیٰ میں یہ لفظ قرآن حکیم کی سورۂ قصص میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی: '' اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ''، لیکن ''احسان'' دین کی ایک اہم اصطلاح بھی ہے۔ چنانچہ اسلام کے بعد ایمان اور ایمان کے بعد احسان کا درجہ ہے۔ اس کا عمومی مفہوم ہے کسی بھی شے میں حسن پیدا کر دینا۔ گویا ایک ہے مارے باندھے کوئی کام کیا، اس کے بنیادی تقاضے اور لوازم پورے کر دیئے، لیکن ایک ہے پوری طرح جان کھپا کر، دل لگا کر، پوری توجہ اور اپنی ساری صلاحیتوں اور توانائیوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کام کو اچھے سے اچھا، عمدہ سے عمدہ انداز سے کرنا۔ چنانچہ ایک حدیث نبویؐ کے الفاظ ہیں: ''اِذَا قَتَلْتُمْ فَاَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ وَاِذَا ذَبَحْتُمْ فَاَحْسِنُوا الذِّبْحَةَ''، یعنی کسی کو قتل کرنا ہے تو بھی خوبصورتی کے ساتھ قتل کرو اور کسی جانور کو ذبح کرنا ہے تو اسے بھی خوبصورتی کے ساتھ ذبح کرو۔ کسی کو اذیتیں دے دے کر نہ مارو۔ آج کل سعودی عرب میں جو beheading ہوتی ہے یعنی جب سر قلم کیا جاتا ہے تو ایک ہی وار ہوتا ہے۔ سوائے رجم کی سزا کے جس کیلئے ایک عبرت ناک ماحول پیدا کرنا مقصود ہے۔ اسی طرح ذبح کرنا مقصود ہو تو چھری تیز ہونی چاہیے تاکہ جانور کو تکلیف کم سے کم ہو، بس ایک ہی مرتبہ آپ کی چھری اس مقصد کو پورا کر دے۔ اسی مفہوم میں یہ لفظ ایک اور حدیث نبویؐ میں نہایت خوبصورتی کیساتھ استعمال ہوا ہے یعنی: ''مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهٗ مَا لَا يَعْنِيْهِ''، یعنی کسی شخص کے اسلام کی خوبی اور خوبصورتی یہ ہے کہ وہ ہر اس

کام کو ترک کر دے جس سے نہ کوئی دنیوی ضرورت پوری ہوتی ہو، نہ اخروی اجر وثواب متوقع ہو۔

یہ بہت بڑی محرومی ہے کہ دین کی ایک اتنی بنیادی اصطلاح جو حدیثِ جبرائیلؑ میں آئی ہے ان الفاظ کے حوالے سے کہ "فَاَخۡبِرۡنِیۡ عَنِ الۡاِسۡلَامِ، اَخۡبِرۡنِیۡ عَنِ الۡاِیۡمَانِ، اَخۡبِرۡنِیۡ عَنِ الۡاِحۡسَانِ "اس سے امت محروم اور محجوب ہوگئی۔ قرآن مجید کی جو آیت میں نے ابتداء میں آپ کو سنائی اس میں ایمان کے دو مرحلے بیان ہوئے، ایک قانونی ایمان اور دوسرا حقیقی ایمان۔ یہ مطالعہ قرآن حکیم کے ہمارے منتخب نصاب کی ایک مرکزی بحث ہے کہ قانونی ایمان یعنی اسلام اور حقیقی ایمان میں کیا فرق ہے۔ قانونی ایمان کے درجے میں عمل علیحدہ ہے ایمان سے، جبکہ حقیقی ایمان کے درجے میں عمل جزوِ لاینفک بن جاتا ہے ایمان کا۔ پھر اس سے اوپر تیسرا درجہ احسان کا ہے۔ اس ضمن میں سورۂ مائدہ کی یہ آیت بڑی اہم ہے:

لَیۡسَ عَلَی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِیۡمَا طَعِمُوۡۤا اِذَا مَا اتَّقَوۡا وَّاٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوۡا وَّاٰمَنُوۡا ثُمَّ اتَّقَوۡا وَّاَحۡسَنُوۡا ؕ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ (۹۳)

جو لوگ بھی ایمان اور عمل صالح پر مسلسل کاربند رہے ان پر کوئی الزام نہیں ان چیزوں کے ضمن میں جو وہ پہلے کھا پی چکے......(یعنی اگر کسی نے کسی شے کی حرمتِ قطعی کا حکم آنے سے قبل کھایا پیا ہے تو اس کا معاملہ یہ نہیں ہے کہ اب وہ حرام شے گویا جسم میں رچ بس گئی ہو)...... درآنحالیکہ ان کی مسلسل روش یہ رہی کہ انہوں نے تقویٰ اختیار کیا پھر ایمان لائے، اور عمل صالح کیا، پھر اور تقویٰ بڑھا تو وہ مزید ایمان لائے (یعنی ایمان حقیقی تک پہنچ گئے۔ نوٹ کیجئے کہ اس آیت میں پہلا ایمان وہ ہے جسے قانونی ایمان کہنا چاہیے، یعنی جس کے ساتھ عمل صالح علیحدہ حیثیت سے آتا ہے، اور دوسرا ایمان وہ حقیقی ایمان ہے کہ جس میں عمل کی کیٹیگری علیحدہ نہیں رہی بلکہ وہ اس کا جزو لاینفک ہے۔ چنانچہ امام بخاریؒ کا قول ہے کہ "اَلۡاِیۡمَانُ قَوۡلٌ وَ عَمَلٌ")۔ اور اس کے بعد جب تقویٰ اور بڑھا تو اب وہ احسان کے

درجے پر فائز ہوگئے۔ "وَاللّٰہُ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ" اور اللہ تعالیٰ کے محبوب تو وہی ہیں جو محسنین میں شامل ہیں۔

اس ضمن میں ایک حدیث رسول ﷺ بھی نوٹ کیجئے کہ "مَا ابۡتَدَعَ قَوۡمٌ بِدۡعَةً اِلَّا نَزَعَ اللّٰہُ عَنۡهُمۡ مِنَ السُّنَّةِ مِثۡلِهٖ" کہ جہاں کوئی بدعت آئے گی وہاں سے کوئی نہ کوئی سنت یقیناً رخصت ہو جائے گی۔ ہر بدعت قامعِ سنت ہے۔ ہر بدعت لازماً کسی سنت کا ازالہ کرے گی یعنی اسے displace کرے گی۔ لہٰذا یہاں پر تصوف کے لفظ نے احسان کی خالص دینی اصطلاح کی جگہ لے لی۔

ii) <u>کتاب وسنت کے شیدائیوں میں تصوف سے بُعد</u>: اس ہمالیہ جیسی غلطی کا دوسرا نتیجہ وہ نکلا جو میرے نزدیک پہلے سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ یعنی کتاب وسنت کے شیدائیوں میں اس سے بُعد پیدا ہوگیا۔ گویا عنوان سے بُعد ہوا تو اس کے contents سے بھی دوری پیدا ہوگئی اور نتیجتاً نری ظاہر پرستی باقی رہ گئی۔ اگرچہ صرف عنوان ہی کی وجہ سے بُعد نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی دیگر وجوہات بھی تھیں جنہیں ہم آگے چل کر سمجھیں گے۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ قلبی وذہنی بُعد کا آغاز عنوان کی تبدیلی ہی سے شروع ہوگیا تھا۔ اور دوری کے اس عمل (Phenomenon) کا نقطۂ عروج ہے محمد بن عبدالوہابؒ کی شخصیت۔

تصوف پر اس انداز سے اعتراض کیا جائے کہ یہ دورِ نبویؐ کے بعد کی پیداوار ہے تو جواباً کہا جاتا ہے کہ دیگر علوم بھی تو حضور ﷺ کے زمانے میں نہیں تھے۔ لیکن تصوف کے سوا دیگر علوم کے عنوانات قرآن وحدیث ہی سے ماخوذ ہیں۔ مثلاً "تفسیر" کا لفظ قرآن مجید میں آیا ہے: "اَحۡسَنَ تَفۡسِیۡرًا" اور یہ لفظ دورِ صحابہؓ میں بھی مستعمل تھا۔ اسی طرح تفقہ کا لفظ قرآن میں ہے، اور حضورؐ کی حدیث ہے کہ "اَللّٰهُمَّ فَقِّهۡهُ فِی الدِّیۡنِ"۔ یہ دوسری بات ہے کہ علم دین کے ایک خاص شعبہ کو فقہ کہہ دیا گیا لیکن یقیناً وہ بھی تفقہ کا جزو ہی ہے۔ اسی طرح حدیث کا لفظ بھی قرآن میں ہے: "فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۢ بَعۡدَهٗ یُؤۡمِنُوۡنَ"۔ یہ قرآن بھی "حدیث" ہی ہے۔ لیکن قرآن حدیثُ اللہ ہے، اور جسے اصطلاح میں حدیث کہتے ہیں وہ

حدیثِ رسولؐ ہے۔لہٰذا ہمارے تمام دینی علوم کا منبع وسرچشمہ قرآن اور حدیثِ رسول ہیں اوران کے عنوانات بھی قرآن وحدیث ہی سے ماخوذ ہیں۔لہٰذا میں اس دلیل کو تسلیم نہیں کرتا کہ جیسے اور دینی علوم ہیں ویسے ہی تصوف بھی ہے۔اس لئے کہ آپ نے عنوان ہی جدا کر دیا اور ایک ایسا لفظ اختیار کر لیا جس کا کتاب وسنت کے ساتھ سرے سے کوئی تعلق نہیں اور مستزاد یہ کہ اس کا یہ بھی کچھ پتہ نہیں کہ یہ لفظ کہاں سے آیا ہے۔اب ظاہر ہے کہ جس شخص کو کتاب وسنت سے لگاؤ اور تمسّک ہے اور جس کی شخصیت میں کتاب وسنت راسخ ہو چکے ہیں اسے یقیناً تصوف سے بُعد نہ سہی حجاب تو ضرور محسوس ہوگا۔لہٰذا تصوف سے بُعد کی پہلی وجہ تو اس کا اجنبی عنوان ہی ہے اور اس میں دیگر اسباب کی وجہ سے اضافہ ہوتا چلا گیا کیونکہ اس فکر میں جو بیرونی نظریات اور فلسفے آئے،ان سے وہ حجابات بڑھتے گئے،یہاں تک کہ انہوں نے منافرت کی شکل اختیار کر لی۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے تصوف سے دوری کی سب سے نمایاں مثال محمد بن عبدالوہابؒ ہیں۔ویسے میں انہیں بھی مجددین کی فہرست میں شامل کرتا ہوں کہ انہوں نے بدعات کا قلع قمع کیا،غیر اسلامی رسومات کی بیخ کنی کی،دین کی تعلیمات پر جو جھاڑ جھنکار آ گیا تھا اسے ہٹایا اور کم از کم دین کے عملی اور ظاہری پہلو کو نکھارنے کا کام سرانجام دیا۔اس پہلو سے وہ مجددینِ اُمت میں شامل ہیں۔لیکن اگر محمد بن عبدالوہاب نجدی کا ان کے ہم عصر حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے تقابل کیا جائے تو محمد بن عبدالوہابؒ کی شاہ ولی اللہؒ کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔شاہ صاحبؒ کی جامعیتِ کبریٰ کو ذہن میں رکھئے کہ وہ ظاہر وباطن دونوں کے جامع ہیں جبکہ محمد بن عبدالوہابؒ کی حیثیت صرف دین اور کتاب و سنت کے ظاہری پہلو کے حوالے سے ہے۔

یہاں ضمنی طور پر اس بات کو بھی سمجھ لیجئے کہ عہد حاضر میں تجدیدی اور احیائی تحریکوں میں دین کے باطنی پہلو کے مفلوج ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان تمام تحریکوں کے سامنے ایک مثال اور امام کی حیثیت سے محمد بن عبدالوہابؒ کی نجدی تحریک رہی ہے۔اس

لئے کہ یہی ایک تحریک تھی جس نے اسلام کا قانونی نظام دوبارہ قائم کیا،شریعت کا نفاذ کیا،شعائرِ دین کی پابندی شروع کی،اگرچہ انہوں نے یہ کام آلِ سعود کے تعاون سے کیا اس کے باوجود یہ تحریک تجدید واحیائے دین کی تمام تحریکوں کے لئے ایک مثال بن گئی۔اس ضمن میں ابن تیمیہؒ کا نام بھی آتا ہے۔لیکن ان کی شخصیت بہت مختلف تھی۔

تصوف کا منصوص ومسنون طریق:

اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں،یعنی تصوف کا طریقِ منصوص مسنون تھا کیا؟ میرے نزدیک جو طریقہ کتاب وسنت سے منصوص ہے وہی طریقِ محمدیؐ ہے اور وہی طریقہ درحقیقت عقل ومنطق سے قریب بھی ہے۔

اس ضمن میں پہلی قابل توجہ بات وہی ہے جو تنظیم اسلامی کی قراردادِ تاسیس کے اولین جملے میں بیان ہوئی ہے یعنی یہ کہ ''دین کا اصل مخاطب فرد ہے''۔مطلب یہ ہے کہ ہر انسان اللہ تعالیٰ کے باغ کا ایک حسین پودا ہے،اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ پودا پروان چڑھے،اس میں جو بھی امکانات اس نے ودیعت فرمائے ہیں وہ بروئے کار آئیں،اس کی شخصیت پھول کی مانند کھلے۔مجھے بیدل کا شعر یاد آ گیا۔

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو وسمن درا
تو زغنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا بہ چمن درا

یہ شعر میرے استاد مولانا منتخب الحق قادری نے ایک کلاس میں پڑھا تھا اور اگرچہ میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنا تھا لیکن یہ ان کے پڑھنے کے انداز کا اعجاز تھا،اور میرے ذہن کی مناسبت کا مظہر،کہ یہ شعر مجھے اسی وقت یاد ہو گیا۔شاعر کہتا ہے کہ بڑا ہی ستم کا معاملہ ہے،بڑا ظلم ہے کہ تجھے خواہش نفس کھینچ کر لے جاتی ہے کہ چلو باغ میں سرو وسمن کی بہار دیکھیں۔حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ تو خود ایک کھلا ہوا غنچہ ہے،اپنے دل کا دروازہ کھول اور جو باطنی چمن اللہ تعالیٰ نے تیرے باطن میں کھلا رکھا ہے کبھی اس کی سیر بھی کر! گویا تم جو خارج کے پھولوں کی سیر کرتے پھرتے ہو کبھی اپنے من میں ڈوب کر بھی دیکھو۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ہر انسان اللہ کا لگایا ہوا پودا ہے اور اللہ چاہتا ہے کہ یہ پھلے پھولے، کُھلے، کِھلے، اس کی شخصیت پروان چڑھے۔ اس کے اندر کے تمام محاسن ظاہر ہوں، تمام امکانات جو اس میں potentially ودیعت کئے گئے ہیں وہ بروئے کار آئیں۔ یہاں پر سورۂ مائدہ ہی کی وہ آیت یاد کیجئے جس میں کہا گیا ہے کہ ”عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ “ یعنی ہر انسان پر اصل ذمہ داری اس کی اپنی ہے۔ دوسروں کیلئے دعوت، تلقین، تبلیغ، نصیحت جو بھی ممکن ہو، کرے، اس لئے کہ یہ کام فرائض کے درجے میں ہیں۔ لیکن اگر میری کوشش کے باوجود کوئی نہیں مانتا تو اپنے اعمال کا ہر شخص خود جوابدہ ہے، میری اصل ذمہ داری میری ذات کی حد تک ہے۔ اگر میری کوتاہی ہوگی تو میں پکڑا جاؤں گا۔ لہٰذا مجھے اس حوالے سے سوچنا چاہیئے کہ میں اپنے فرائض ادا کروں۔ جہاں تک دوسروں کا تعلق ہے اس ضمن میں یہ اصول بیان فرما دیا گیا ہے کہ ”لَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ“ آپ سے تو مواخذہ نہیں ہوگا کہ یہ لوگ کیوں جہنم میں چلے گئے۔

سورۂ مائدہ کی مذکورہ بالا آیت کا غلط مفہوم بھی لیا گیا ہے، اور یہ غلطی دورِ صحابہؓ ہی میں ہونے لگی تھی۔ لوگوں نے اس آیت کو دلیل بنایا اس بات پر کہ ہمیں دعوت وتبلیغ یا نصیحت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس دور میں بھی ہر طرح کے لوگ موجود تھے، منافقین بھی تھے اور اپنے فرائض سے جی چرانے والے بھی۔ لہٰذا اُس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خطبے میں ارشاد فرمایا کہ تم اس آیت کا غلط مفہوم لے رہے ہو، ”عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ“ سے یہ مراد نہیں ہے کہ تم دعوت وتبلیغ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضے سے بری ہو گئے ہو۔ تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ ہر شخص پر اصل ذمہ داری اس کی اپنی ذات ہی کے حوالے سے عائد ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کا قول قرآن میں نقل ہوا ہے کہ: ”رَبِّ اِنِّيْ لَا اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ“ کہ اے رب میرا اختیار تو صرف اپنے نفس پر اور اپنے بھائی (ہارونؑ) پر ہے۔ یہاں بھائی کا ذکر بھی صرف اس لئے آ گیا کہ وہ خود تیار تھے، ورنہ ظاہر ہے کہ اپنے

بھائی پر بھی کسی انسان کو اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ اسی طرح فرمایا کہ: ”اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ“ (یعنی ”اے نبیؐ! آپؐ جسے چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے، یہ تو صرف اللہ کے اختیار میں ہے کہ جسے چاہے ہدایت سے نواز دے۔“

انسانی شخصیت کے ارتقاء کے دو پہلو

لہٰذا پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر انسانی شخصیت کا ارتقاء ہونا ہے اور اس شخصیت کی تعمیر یعنی اس میں ودیعت شدہ potentialities کو بروئے کار لانا ہے تو یہ کام کس طرح ہوگا؟ یہاں اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہیے کہ انسان کا وجود دو اجزائے ترکیبی پر مشتمل ہے جو باہم متضاد ہی نہیں، ایک دوسرے کے مخالف بھی ہیں۔ متضاد کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ دو چیزوں میں باہم تضاد پایا جاتا ہو، اور ضروری نہیں کہ ان میں مخالفت اور کشمکش بھی ہو رہی ہو۔ جبکہ مخالفت کا مفہوم یہ ہے کہ ان کے مابین رسہ کشی یا کھینچ تان کی کیفیت بھی ہے۔ انسانی شخصیت کے اندر دو متحارب اور باہم مخالف اور متضاد عناصر اس کا نفسِ حیوانی اور اسکی روحِ ملکوتی ہیں۔ لہٰذا کرنے کا کام یہ ہے کہ روحانی عنصر کی تقویت وتغذیہ کا سامان کیا جائے اور دوسری طرف حیوانی عنصر کی ”تہذیب“ وتزکیہ کا بندوبست کیا جائے۔ اس عمل اور جدوجہد کے دو رخ (aspects) ہوں گے۔ اس بات کو اس حدیث کے حوالے سے سمجھئے جس میں بتایا گیا ہے کہ رمضان کے دنوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی منادی ندا کرتا ہے: ”يَا بَاغِيَ الْخَيْرِ اَقْبِلْ وَ يَا بَاغِيَ الشَّرِّ اَدْبِرْ!“ یعنی اے خیر کے طالب آگے بڑھ کہ یہ نیکیوں کا موسم بہار ہے اور اے شر کے طالب پیچھے ہٹ اور لوٹ جا! ہمارے اندر بھی ایک خیر کا عنصر ہے اسے تقویت دیجئے، اس کی تقویت وتغذیہ کا اہتمام کیجئے، یہ ایک رخ ہو گیا۔ دوسرا رخ جو شر کی طرف کھینچنے والا عنصر ہے اس کو دبایئے، اسے contain کیجئے، اس کی تہذیب کیجئے، اس کا تزکیہ کیجئے۔

اس تہذیب وتزکیہ کا مقصد نفس کو فنا کر دینا نہیں ہے۔ ضبطِ نفس یعنی self-control اور تہذیب وتزکیۂ نفس یعنی self purification، یہ دونوں چیزیں

مطلوب ہیں۔لیکن نفس کُشی یا self-annihilation کا اسلام میں کوئی تصور نہیں ہے۔ یہ چیز دراصل باہر سے آئی ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے انسانوں کی جو اقسام بیان کی ہیں وہ انہی دو عناصر کی بنیاد پر ہیں، یعنی قوت ملکوتی اور قوتِ بہیمی۔ سب سے بلند درجے پر وہ لوگ ہیں جن کی مَلَکیت بھی بہت قوی اور بہیمیت بھی قوی ہے۔ اس لئے کہ قوتِ کار اور قوت عمل دراصل بہیمیت ہی سے متعلق ہے۔ اور سب سے نچلے درجے پر وہ لوگ ہیں کی بہیمیت قوی اور مَلَکیت ضعیف ہے۔ بہر حال نوٹ کیجئے کہ اسلام میں نفس کُشی یا self-annihilation کا کوئی مقام نہیں ہے، البتہ ضبطِ نفس یعنی self-control کا حصول مطلوب ہے، جسے میں تہذیبِ نفس کہہ رہا ہوں، اور دوسری مطلوب شے ہے تزکیۂ نفس یعنی self purification...... ان دونوں کا ایک نتیجہ نکلتا ہے جس کے لئے میں نے ایک نئی اصطلاح وضع کی ہے یعنی "تحریرُ الرُّوح"۔ میں یہاں "تحریر" کا لفظ اس کے بنیادی لغوی مفہوم یعنی حریت کے معنی میں استعمال کر رہا ہوں۔ تحریر الروح یعنی liberation of the soul or spirit...... یہ نکتہ "عظمتِ صوم" نامی کتابچے میں بیان ہو چکا ہے کہ نفسِ حیوانی کا غلبہ جتنا شدید ہوگا اسی قدر ہماری روح ان بیڑیوں میں مقید رہے گی، اور نفسِ حیوانی کا غلبہ جتنا کمزور پڑے گا اسی تناسب سے روح کو آزادی ملے گی۔ تہذیب وتزکیۂ نفس کا نتیجہ تحریر الروح کی شکل میں نکلتا ہے، یعنی روح درحقیقت نفس امارہ کے تسلط سے آزاد ہوتی ہے۔

روح کی تقویت کا ذریعہ: ذکرِ الٰہی

اب تک ہم نے یہ سمجھا ہے کہ دین کا اصل مقصود فرد کی تعمیر وترقی ہے۔ فرد مرکب ہے دو متخالف اور متحارب عناصر سے، لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ خیر کی قوت یعنی روح کی تقویت اور تغذیہ کا بندوبست ہو اور شر کی طاقت یعنی نفسِ امارہ کی تہذیب اور تزکیہ کا سامان کیا جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ روح کی تقویت کا کیا ذریعہ ہے؟ ایک لفظ میں اسے بیان کیا جائے تو وہ ہے ذکرِ الٰہی۔ اس کا فلسفہ کیا ہے؟ ۱۹۶۵ء میں اپنے مشن کے لئے ذاتی اور

انفرادی سطح پر کام کا آغاز کرنے کے بعد میرا جو پہلا کتابچہ شائع ہوا تھا یعنی "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق"، مَیں اُس میں اس بات کی پوری وضاحت کر چکا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ روح انسانی میں اللہ تعالیٰ کی معرفت موجود ہے ایک شعورِ خفتہ (dormant consciousness) کی شکل میں! اس لئے کہ ہماری روح اللہ تعالیٰ کی ذات کا جزو تو ہرگز نہیں ہے، لیکن صادر تو وہیں سے ہوئی ہے۔ یہ امرِ رب ہے۔ تو کیا یہ روح اندھی اور بہری ہو سکتی ہے؟ معاذ اللہ! البتہ سوئی ہوئی ہے، اور اللہ کا ذکر اس کو بیدار کرتا ہے۔ جناب یوسف سلیم چشتی مرحوم نے ایک مرتبہ جرمن فلسفی کانٹ کا ایک جملہ سنایا تھا:

"Hume awakened me from my dogmatic slumber"

انگریزی فلسفی ڈیوڈ ہیوم کی کتابیں پڑھ کر کانٹ کہتا ہے کہ میں اپنے اندھے عقیدے کی دھن میں سویا ہوا تھا کہ ہیوم نے مجھے جگا دیا۔ اسی طرح حفیظ جالندھری کی ایک نظم ہے "جاگ سوزِ عشق جاگ"۔ اور میں نے اپنے ہائی سکول کے بالکل ابتدائی زمانے میں ایک گیت سنا تھا جس کے یہ الفاظ آج بھی مجھے یاد ہیں ؎ "تم ہی نے مجھ کو پریم سکھایا، سوئے ہوئے ہردے کو جگایا"۔ ہندی میں "ہردہ" کہتے ہیں جی یا نفس کو۔ تو یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے کہ انسان کی روح میں سب کچھ پہلے سے موجود ہے۔ میں نے اپنے کتابچے "نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت" میں دو الفاظ استعمال کئے ہیں کہ اس روح کے اندر معرفتِ رب بھی موجود ہے اور محبتِ رب بھی۔ اس کی ہمارے بعض عارفین نے جو مثال دی ہے وہ یہ ہے کہ ہماری روح کا ذات باری تعالیٰ کے ساتھ وہی تعلق ہے جو سورج کی کرن کا سورج کے ساتھ ہوتا ہے۔ سورج کی کرن اپنے source سے کروڑ ہا میل دور چلی جائے لیکن اس کا تعلق سورج سے منقطع نہیں ہوتا۔

لہٰذا ذکر الٰہی کا اصل فائدہ یہ ہے کہ اس کی بدولت روح بیدار ہوتی ہے، اس کا سویا ہوا شعور متحرک (activate) ہوتا ہے۔ اس ضمن میں سورہ نور کے پانچویں رکوع کے درس میں جو بحث آتی ہے اس کو بھی ذہن میں تازہ کر لیجئے۔ یعنی یہ کہ نورِ وحی اور نورِ فطرت کے

امتزاج سے ہی نورِ ایمان وجود میں آتا ہے اور درحقیقت یہ سارا معاملہ ایمان ہی کا ہے۔ ایمان صرف زبانی اقرار تک ہے تو یہ ''اسلام'' ہے۔ جب ایمان دل کی گہرائی میں اتر کر راسخ ہوگیا اور تصدیق بالقلب حاصل ہوگئی تو یہ ''ایمان'' ہے۔ پھر جب اسی ایمان میں وہ شدت اور گہرائی پیدا ہوگئی کہ مومن یہ محسوس کرنے لگا کہ وہ گویا اللہ کو دیکھ رہا ہے یا کم سے کم یہ استحضار حاصل ہوگیا کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے تو یہ ''احسان'' کی منزل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ''احسان'' کے درجے کو بیان کرنے کیلئے ہماری زبان میں اس سے بہتر کوئی مثال نہیں ہے کہ یہ ایمان کی اس کیفیت کا نام ہے کہ ایک شخص غیبی حقائق کو گویا آنکھوں کے سامنے موجود پائے۔ یقین کی گہرائی کیلئے اس سے آگے کوئی استعارہ اور کوئی تعبیر ممکن نہیں ہے۔ ایمان جب اس شدت کو پہنچ جاتا ہے کہ ''كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاه فَاِنَّهٗ يَرَاكَ'' کی کیفیت حاصل ہو جائے ، یعنی یہ کہ بندہ اللہ کی عبادت اور اللہ کی رضا جوئی کیلئے عمل اتنی شدت اور خلوص و اخلاص سے کرنے لگے کہ گویا وہ اسے (اللہ کو) دیکھ رہا ہے اور اگر وہ اللہ کو نہیں دیکھ رہا تو اللہ تو یقیناً اسے دیکھ رہا ہے۔ تو یہی احسان ہے اور یہی مقام ولایت ہے۔

حصول ایمان کے ذرائع

اب یہاں میں اصل موضوع سے کسی قدر ہٹ کر ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔ اسے ایک ضمیمہ سمجھ لیجئے۔ اس بات کو میں نے حقیقت ایمان کے موضوع پر ہونے والے محاضرات میں تفصیل سے بیان کیا ہے کہ حصول ایمان کے تین ذرائع ہیں اولاً یہ کہ صاحب یقین کی صحبت سے ایمان حاصل ہوتا ہے، جیسے آپ آگ کی بھٹی کے پاس بیٹھیں گے تو حرارت ملے گی۔ ثانیاً یہ کہ شریعت پر عمل پیرا ہونے سے بھی ایمان پیدا ہوتا ہے۔

لیکن یہ دونوں قسم کے ایمان ایک نوع کے blind faith کے درجے میں ہیں، اس میں شعوری یا intellectual عنصر ضروری نہیں ہے۔ اس میں فہم و تفقہ بھی ضروری نہیں! اگرچہ ان ذرائع سے حاصل ہونے والے ایمان میں گہرائی تو ہوسکتی ہے لیکن اس میں وسعت فکر و نظر نہیں ہوگی۔ وہ ایمان جس میں شدت یقین کے ساتھ ساتھ وسعت فکر و نظر

بھی ہو، جس میں گہرائی کے علاوہ ایک شعوری یا intellectual عنصر بھی ہو، ایسا ''علیٰ وجہ البصیرت'' ایمان صرف اور صرف قرآن سے ملے گا۔ قرآن کے سوا کسی اور ذریعے سے اس نوعیت کا ایمان نہیں مل سکتا۔ یہاں اس نکتے کو بھی سمجھ لیجئے کہ حدیث کی رو سے ایمان کا افضل ہونا اور شے ہے اور ایمان کا اعجب یا most wonderful اور most fascinating ہونا اور شے ہے۔ یعنی ایک ایمان کی افضلیت ہے اور دوسرے اس کی اعجبیت ہے۔ اہل سنت کے ہاں یہ مسلم ہے کہ سب سے افضل ایمان صحابہ کرامؓ کا ہے، یہاں تک کہ ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کا ایمان بھی بڑے سے بڑے ولی اللہ اور دانشور کے شعوری ایمان سے افضل مانا جائے گا۔ لیکن یہ ذہن میں رکھئے کہ مختلف صحابہؓ کے ایمان میں بھی فرق تھا۔ ظاہر ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی صحبت تو تمام صحابہ کو حاصل تھی لہٰذا صحبت سے حاصل ہونے والا ایمان سب میں مشترک تھا، لیکن صحابہؓ میں بہت سے فہیم اور باشعور یعنی intellectual افراد بھی تھے جنہوں نے قرآن حکیم سے شعوری ایمان اخذ کیا تھا۔ لہٰذا یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ معاذ اللہ تمام صحابہ کرام کا ایمان محض blind faith تھا، اگرچہ یہ اپنی جگہ حقیقت ہے کہ صحابہؓ کا غیر شعوری ایمان بھی چونکہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی صحبت سے حاصل ہوا تھا لہٰذا وہ قیامت تک افضل رہے گا۔ البتہ ایمان کا حسین اور اعجب ہونا ایک بالکل مختلف بات ہے، اور یہ راستہ آج بھی کھلا ہوا ہے۔ دیکھئے حضور ﷺ نے ہمارے احساسِ محرومی کے ازالے کے لئے کیسی کیسی باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ میری امت کا معاملہ بارش کی مانند ہے، نہیں کہہ سکتے کہ اس کا اول حصہ بہتر ہوگا یا آخر۔ لہٰذا اگر ہم حضور ﷺ کے زمانے میں پیدا ہونے سے محروم رہ گئے تب بھی کوئی حرج نہیں کہ صدیقیت اور شہادت اور صالحیت کے تمام مراتب آج بھی قابل حصول ہیں۔ صرف نبوت کا دروازہ بند ہے، لیکن وہ تو صحابہؓ کیلئے بھی بند تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ مراتب حاصل کرنے کے مواقع موجود ہیں، محنت کرو اور اکتساب کرو۔ دوسری وہ حدیث ہے جس میں حضورؐ نے صحابہؓ سے سوال کیا کہ تمہارے نزدیک مخلوقات میں حسین ترین (اعجب) ایمان کس کا ہے؟ انہوں نے کہا

ملائکہ کا۔ آپؐ نے فرمایا کہ ملائکہ کیسے ایمان نہ لاتے وہ تو اپنے رب کے حضور میں حاضر ہیں، ان پر تو حقائق منکشف ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ان کا کیا کمال ہوا؟ صحابہؓ نے کہا کہ پھر انبیاءؑ کا ایمان اعجب ہے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ وہ کیسے ایمان نہ لاتے، ان پر تو وحی نازل ہوتی ہے۔ اس پر صحابہؓ نے عرض کیا کہ پھر ہم ہیں۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ تم کیسے ایمان نہ لاتے جبکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں۔ پھر آپؐ نے فرمایا: ''اِنَّ اَعْجَبَ الْخَلْقِ اِلَیَّ اِیْمَاناً لَاِ خْوَانِنَا الَّذِیْنَ یَأْتُوْنَ مِنْ بَعْدِی یَجِدُوْنَ صُحُفًا فِیْہِ کِتَابُ اللّٰہِ فَیُؤْ مِنُوْنَ بِمَا فِیْھَا'' یعنی: میرے نزدیک تو سب سے حسین ایمان ہمارے ان بھائیوں کا ہوگا جو میرے بعد آئیں گے (وہ میری صحبت نہیں پائیں گے بلکہ) انہیں تو اوراق ملیں گے جن میں اللہ کی کتاب درج ہوگی اور وہ اس پر ایمان لائیں گے۔

ذکرِ الٰہی کے ضمن میں قرآن کا مقام

اب تک ہم نے جو بات سمجھی ہے وہ یہ ہے کہ اصل کام روح کو تقویت پہنچانا ہے، اس کا ذریعہ ذکرِ الٰہی ہے اور اس کا حاصل ایمان ہے۔ ذکرِ الٰہی کے ضمن میں اہم ترین شے قرآن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن اپنے آپ کو ''الذکر'' کہتا ہے۔ یہاں الف لام کو خواہ حصر کیلئے سمجھا جائے خواہ جنس کیلئے، دونوں صورتوں میں مطلب یہی ہوگا کہ کُل کا کُل ذکر یہی ہے اور جنسِ ذکر اس قرآن میں محصور ہوگئی ہے۔ تبعاً ذکر میں نماز بھی شامل ہے۔ لیکن نوٹ کیجئے کہ نماز میں بھی دو elements ہیں، ایک عملی ذکر ہے یعنی رکوع، سجود، قیام، اور دوسرے خود قرآن ہے۔ چنانچہ قرآن نے فجر کی نماز کو تو کہا ہی ہے ''قرآن الفجر''۔ اسی طرح رات کی تہجد ہے تو وہ بھی قرآن کے ساتھ ادا کرنا مطلوب ہے۔ تیسرے درجے میں نبی اکرمؐ سے روزمرہ معمولات کے ضمن میں جو اذکار منقول ہیں ان کی پابندی کی جائے تو یہ بھی ذکرِ الٰہی کی ایک صورت ہوگی۔

تزکیۂ نفس، ایمان اور احسان کے حوالے سے جو بات ہم نے سمجھی ہے اسے صوفیاء کی اصطلاحات کے حوالے سے بھی سمجھ لیں۔ میں نے شروع میں ''تجلیۂ روح'' کا لفظ

استعمال کیا تھا۔ صوفیاء کہتے ہیں کہ جیسے سورج کی ایک کرن ہو جو کسی سبب سے ٹھنڈی پڑ گئی ہو، بس ایسا ہی روح کا معاملہ ہے، ذکرِ الٰہی کے ذریعے گویا آپ نے اسے دوبارہ حرارت پہنچانا شروع کی۔ اس کی روشنی ماند پڑ گئی تھی آپ نے اسے دوبارہ روشن کرنا شروع کیا۔ یہ تجلیہ ہے! اور یہاں بھی میں لفظ ''تحریر الروح'' کو لانا چاہتا ہوں، لیکن یہاں ''تحریر'' کا لفظ حرارت سے ہے۔ روح کا تجلیہ اور روح کو حرارت بہم پہنچانا، یہی ذکر کا اصل کام ہے۔ البتہ ذکر کے ضمن میں اصل شے قرآن ہے، پھر نماز آتی ہے، اور اس کے بعد اذکارِ مسنونہ ہیں۔

'تحریر الروح' کا منطقی نتیجہ

اس نئی اصطلاح ''تحریر الروح'' کے جو دو معانی میں نے بیان کئے ہیں، یعنی ایک آزاد کرنا اور دوسرے حرارت پہنچانا، تو اس عمل کا منطقی نتیجہ وہ ہے جسے حکیم فلاطینوس (Plotinus) نے نہایت خوبصورت الفاظ میں بیان کیا ہے، یعنی "Flight of the alone to the Alone" درحقیقت ہماری روح بھی بلاتشبیہہ، ذاتِ باری تعالیٰ کی طرح، انتہائی تنہا ہے۔ روح کا کسی سے کوئی رشتہ نہیں، روح کسی کی باپ ہے نہ کسی کا بیٹا، نہ کسی کا شوہر نہ کسی کی بیوی۔ اس کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ جدید فلسفے میں بھی وجودیت کے حوالے سے ''کرب'' کا لفظ کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ جو شخص بھی ذہنی اور نفسیاتی اعتبار سے بلند ہونا شروع ہوتا ہے اس میں تنہائی کا احساس بڑھنے لگتا ہے، گویا جتنا اس کے اندر تنہائی کا احساس شدید ہوگا اسی قدر وہ حیوانی سطح سے بلند ہوتا جائے گا۔

چنانچہ ایک طرف انسانی روح کی یہ مطلق ''انفرادیت'' (individuality) ہے اور دوسری طرف وہ ذات ہے جو ''الاحد'' ہے اور جس کی ''فردیت'' میں کسی بھی نوع کی ثنویت کا سرے سے کوئی احتمال تک نہیں ہے! اب اس قاعدہ کلیہ کے مطابق کہ ہر شے اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے اور اپنے مرکز اور source کی جانب رجوع کرتی ہے، روح انسانی کا اصل رجحان اللہ تعالیٰ کی جانب ہے۔ گویا روح کی مثال ایک پرندے کی سی ہے جو جسم اور

حیوانیت کے پنجرے میں مقید ہے، یہ پرندہ پھڑ پھڑاتا ہے اور قید سے آزاد ہو کر اوپر اٹھنا چاہتا ہے، چنانچہ اسی کو حکیم فلاطینوس نے ''تنہا'' کی پرواز ''تنہا'' کی جانب سے تعبیر کیا ہے جس میں ہم احتیاطاً یہ اضافہ کر سکتے ہیں کہ ''محدود تنہا'' کی پرواز ''لامحدود تنہا'' کی جانب! یہاں اقبال کے دو اشعار ملاحظہ کیجئے۔

مرا دل سوخت بر تنہائی او
کنم سامان بزم آرائی او
مثال دانہ می کارم خودی را
برائے او نگہ دارم خودی را

یعنی میرا دل جلتا ہے اس صدمے اور رنج سے کہ اللہ اکیلا ہے، تنہا ہے۔ لہٰذا میں اس کی محفل سجانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جیسے دانے کو پروان چڑھایا جاتا ہے تو وہ پودا بنتا ہے، کسان اسے پالتا اور پوستا ہے اسی طرح میں اپنی خودی کی پرورش کر رہا ہوں اور اسے پال پوس رہا ہوں، اور اللہ تعالیٰ کیلئے اپنی خودی یعنی اَنا یا روح کی حفاظت کر رہا ہوں۔

بہرحال، ان فلسفیانہ اور شاعرانہ خیال آرائیوں سے قطع نظر، اب تک کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ روح کی تقویت کا سامان کرنا ہر انسان کیلئے لازم ہے، جس کا ذریعہ ایک لفظ میں بیان کریں تو وہ ''ذکر'' ہے اور اس کی شرح کریں تو سب سے بڑا ذکر خود قرآن ہے، پھر نماز اور پھر ادعیہ واذکارِ مسنونہ۔ اس سے تجلیۂ روح کا مقصد حاصل ہوگا اور ایمان کی شدت اور گہرائی میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا، یہاں تک کہ انسان منزلِ ''احسان'' کو پالے گا۔

تہذیب وتزکیۂ نفس کے ذرائع

تقویت وتغذیۂ روح کے ساتھ جو دوسرا عمل درکار ہے اسے میں نے تہذیب وتزکیۂ نفس سے تعبیر کیا تھا۔ تہذیب وتزکیۂ نفس کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا؟ مخالفتِ نفس کی ریاضتیں! ریاضت کسے کہتے ہیں؟ مشقیں یا exercises۔ جیسے جسمانی ریاضت کو آپ کسرت کہتے ہیں جو پہلوان کرتا ہے۔ اسی طرح موسیقی سیکھنے والا ریاض کرتا

ہے، اسے بھی خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ سُر ٹھیک نہیں ہوتا۔ اسی پر قیاس کر کے سمجھئے کہ نفسِ امارہ کی گرفت کو کمزور کرنے کے لئے بھی بڑی محنت کرنا پڑتی ہے، نفس کی مخالفت کرنا پڑتی ہے۔

اس ریاضت میں سب سے پہلی چیز ''اقامت الصلوٰۃ'' ہے۔ مجرد نماز تو ذکرِ الٰہی کا ذریعہ ہے اور اس اعتبار سے تقویت وتغذیہ روح کا سامان ہے، لیکن اقامت الصلوٰۃ یعنی نماز کو قائم کرنا، کہ کوئی مصروفیت، کوئی دوستی، کوئی کاروبارِ دنیوی آڑے نہ آنے پائے، یہ مخالفتِ نفس کی ریاضت ہے۔ طبیعت آمادہ ہو یا نہ ہو، مسجد میں آنا ہے۔ شدید سردی ہے اور یخ پانی ہی دستیاب ہے تو اسی سے وضو کرنا پڑے گا۔ اس سے آگے بڑھ کر تہجد کی نماز میں نیند کو قربان کر کے کھڑا ہونا ہے تو یہ بھی مخالفتِ نفس ہی کی ایک صورت ہے۔ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً ...... یہ تہجد نفس کو کچلنے میں نہایت مؤثر ہے۔ پھر روزہ ہے، جس میں جسمانی تقاضوں کی مخالفت کی جاتی ہے۔ تیسری شے انفاق مال ہے۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کیلئے بھی نفس کی مخالفت ہوتی ہے کیونکہ مال و دولت انسان کو بہت محبوب ہوتا ہے۔ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ۔

نوٹ کیجئے کہ اقامت الصلوٰۃ، صوم، اور انفاقِ مال سے مخالفت نفس کا مقصد حاصل ہوتا ہے، اور یہی مقصد دو اور فرائض کے ذریعے بھی پورا ہوتا ہے۔ یہ دونوں فرائض اصل میں ان تینوں کے جامع ہیں۔ پہلی چیز ہے حج۔ اس میں انفاق مال بھی ہے، احرام کی پابندیاں بھی ہیں، ذکر بھی ہے، نہایت شدید مشقت بھی ہے۔ اور دوسری شے ہے دعوتِ دین اور اقامت دین کی جدوجہد۔ اس میں بھی مخالفت نفس ہوتی ہے۔ محنت اور مشقت ہے جو آرام واستراحت کے منافی ہے۔ تہمت و ملامت ہے جو تحسین وتعریف کے منافی ہے۔ یہ وہ ضرورت ہے جس کیلئے صوفیاء کے ایک طبقے نے باقاعدہ فرقہ ملامتیہ ایجاد کیا، کیونکہ یہ بھی نفس کی مخالفت ہی کی ایک صورت ہے کہ لوگ کسی کو حقیر سمجھیں، گالیاں دیں، فاسق وفاجر کہیں۔ آپ آگے بڑھ کر حق کی دعوت دیجئے، اس راہ میں تو محمدٌ رسول اللہ ﷺ

جیسے شخص کو بھی کہا گیا کہ (معاذ اللہ) یہ ''مجنون'' ہیں، مسحور ہیں، شاعر ہیں، کذّاب ہیں، ساحر ہیں۔ (**نعوذ باللہ من ذلك**)......لیکن حکم ہے کہ صبر کرو۔ تو مخالفتِ نفس کا مقصد حاصل ہو گیا یا نہیں؟ آپ اقامت دین کی جدوجہد میں مال خرچ کر رہے ہیں، یا اگر وقت صرف کر رہے ہیں تو بھی عام مقولے ''Time is money'' کے مطابق یہ انفاقِ مال ہی ہے۔ پھر آپ اپنی اور اپنی آل واولاد کی جانوں کیلئے آفات اور مصائب کا خطرہ مول لے رہے ہیں۔ قتال کا مرحلہ ہے تو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آ رہے ہیں۔ اس طرح بنیادی حیوانی داعیات میں سے دو، یعنی بقائے نفس (Preservation of the self) اور بقائے نسل (Preservation of the species) کی مخالفت ہو رہی ہے یا نہیں؟ اب اس میں سمجھنے کا نکتہ یہ ہے کہ کسی بھی ماحول میں دو ہی صورتیں ممکن ہوتی ہیں: اگر اللہ کا دین غالب ہے اور اسلامی ریاست موجود ہے تو مخالفتِ نفس کیلئے اقامتُ الصلوٰۃ، صوم، انفاق اور حج کے ذرائع اختیار کیجئے۔ اور اگر اللہ کا دین پامال ہے تو مخالفت نفس کی ریاضتوں کے سلسلے میں بھی دعوتِ دین اور اقامتِ دین کی جدوجہد کو تمام نفلی عبادات پر فوقیت حاصل ہو جائے گی۔

دعوت و اقامت دین کی جدوجہد میں انفرادی اعتبار سے جو اصل ہدف ہے وہ ہمارے سامنے آ گیا، یعنی مخالفتِ نفس کی ریاضت تاکہ روح کو تجلیۂ حاصل ہو جائے۔ اب اجتماعی پہلو سے دیکھئے کہ اس میں اضافی حکمت کیا ہے۔ اس جہاد کا ہدف ہے نظام عدل و قسط کا قیام، تاکہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں انسانوں کیلئے اس سلوک کی راہ کو اختیار کرنا ممکن ہو سکے۔ غور کیجئے کہ کس قدر خود غرضی کا مظاہرہ کرتا ہے وہ شخص جو برس ہا برس جنگلوں اور ویرانوں میں مخالفت نفس کیلئے مشقتیں جھیل رہا ہے، خود کو مانجھ رہا ہے، رگڑ رہا ہے، اور دوسری طرف کروڑوں انسان مسلسل ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ انسانوں کی عظیم اکثریت کو وہ موقع ہی میسر نہیں کہ کوئی اعلیٰ خیال یا اونچا آدرش ان کے حاشیۂ خیال ہی میں گزر سکے۔ اگر تم اپنی روح کو نفس کی بیڑیوں سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہے ہو تو

دوسروں کو بھی ظلم واستحصال سے نجات دلانے کی جدوجہد کرو تاکہ وہ بھی اس راہ میں آگے بڑھ سکیں۔

یہ نکتہ میں نے ''نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت'' نامی کتابچے میں تفصیل سے بیان کیا ہے کہ حضور ﷺ کی بعثت تاریخ انسانی کے ایک نہایت اہم موڑ پر ہوئی ہے۔ حضورؐ کی بعثت کے بعد سے افراد کے ارادے اور اختیار کی آزادی محدود سے محدود تر ہوتی چلی گئی ہے اور اجتماعی نظام کی گرفت روز بروز شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی ہے۔ اب یہ ممکن ہی نہیں رہا کہ انسان اپنے اجتماعی ماحول اور مجموعی نظام کے اثر سے آزاد ہو کر زندگی گزار سکے۔ چنانچہ آج ظالمانہ نظام کی گرفت اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ سیاسی جبر، معاشی استحصال اور معاشرتی اونچ نیچ پر مبنی اجتماعی نظام سے فرد کا متاثر نہ ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ حضور ﷺ کی حدیث ہے کہ: ''كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَّكُوْنَ كُفْرًا''، یعنی فقر وفاقہ، احتیاج اور افلاس انسان کو کفر تک پہنچا دیتے ہیں۔ ورنہ کم از کم اللہ تعالیٰ سے غافل تو کر ہی دیتے ہیں۔ بقول فیض ؎

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

اس سلسلے میں اصل حکیمانہ قول حضرت شاہ ولی اللہؒ کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس معاشرے میں تقسیم دولت کا نظام غیر منصفانہ ہو گا وہاں ایک جانب دولت کے انبار لگیں گے، عیاشیاں ہوں گی، بدمعاشیاں اور خرمستیاں ہوں گی، اور دوسری طرف فقر واحتیاج کا دَور دَورہ ہو گا۔ اور انسانوں کی عظیم اکثریت بار برداری کے حیوانات کی مانند زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ سے وہ بھی غافل اور یہ بھی غافل، وہ بھی محروم اور یہ بھی محروم، ان حالات میں نظامِ عدلِ اجتماعی کے قیام کے بغیر انسانوں کی عظیم اکثریت کیلئے روحانی ترقی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہاں ایک اور نکتہ بھی ذہن نشین کر لیجئے کہ خدمتِ خلق کی تین منزلیں ہیں۔ پہلی منزل ہے بھوکوں کو کھانا کھلانا، ضرورت مندوں کی امداد کرنا۔ اور ایک داعئ حق کے لئے یہ چیز

نہایت ضروری ہے، ورنہ اس کی دعوت دوسروں تک نہیں پہنچ پائے گی —— دوسری منزل ہے خدمتِ خلق کے حوالے سے لوگوں کی عاقبت سنوارنے کی کوشش کرنا، اللہ کی طرف دعوت دینا۔ اس سے بڑی کوئی خدمت خلق نہیں ہوسکتی کہ انسان دوسروں کی ابدی زندگی کی فلاح کیلئے کوشش کرے —— خدمتِ خلق کی تیسری منزل یہ ہے کہ خلق خدا کو ظالمانہ نظام کے جبر واستحصال سے نجات دلانے کی کوشش کی جائے۔ صرف پہلی قسم کی خدمتِ خلق کو کُل سمجھ لینا دراصل دین کے محدود تصور کا شاخسانہ ہے۔

سلوکِ محمدیؐ سے انحراف کے اسباب

قرآن و سنت کی ایک بنیادی اصطلاح ''احسان'' جس کیلئے بعد کے ادوار میں ''تصوف'' کا لفظ اختیار کرلیا گیا، اس کے مقاصد اور اس کے منصوص و مسنون اور ماثور طریقوں پر ہم گفتگو کر چکے ہیں۔ اب ہمارے سامنے موضوع یہ ہے کہ اس ضمن میں حضور ﷺ کے بتائے ہوئے راستے سے انحراف کس نوعیت کا تھا اور یہ کن اسباب سے ہوا؟ اس بحث کو میں دو عنوانات کے تحت بیان کرنا چاہتا ہوں۔

i) قرآن حکیم سے بُعد: اس ضمن میں پہلا نکتہ ہے قرآن حکیم سے بُعد کا پیدا ہونا۔ اسلام کے ابتدائی دور کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ذکرِ الٰہی کے لئے مرکز ومحور قرآن حکیم نہ رہا، بلکہ اس کے بجائے رفتہ رفتہ نت نئے اوراد واذ کار رائج ہونے لگے۔ قرآن حکیم سے دوری کا اصل سبب تو وہ فطری اور طبعی معاملہ تھا جسے میں ''قرآن اور جہاد'' نامی اپنی تحریر میں بیان کر چکا ہوں (یہ تحریر اب ''دعوت رجوع الی القرآن کا منظر وپس منظر'' میں شامل کر دی گئی ہے۔) تاہم اس دوری کے بعض ثانوی اسباب بھی تھے۔ سب سے پہلے اصل اور بنیادی وجہ کو سمجھئے۔ اسلام کے اولین دور میں اہم ترین حقیقتیں دو ہی تھیں، یعنی قرآن اور جہاد۔ ایک مردِ مومن کی شخصیت کا جو معنوی ہیولا خود قرآن سے ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہی ہے کہ اس کے ایک ہاتھ میں قرآن ہوگا اور دوسرے میں تلوار۔ قرآن سے ایمانِ حقیقی حاصل ہوتا ہے اور ایمان کا عملی اظہار جہاد فی سبیل اللہ کی صورت میں ہوتا ہے۔ لیکن جب اسلام دعوت و

تحریک کے مرحلے سے گزر کر سلطنت وریاست کے مرحلے میں داخل ہوگیا تو اس تبدیلی کے بعض فطری، طبعی، منطقی، اور ناگزیر (inevitable) نتائج برآمد ہوئے۔ یہ نتائج اسی طرح ناگزیر تھے جیسے جوانی کے بعد بڑھاپا آتا ہے۔ سلطنت اور ریاست میں اصل زور قانون پر ہوتا ہے، لہٰذا ہمارے ہاں بھی ایمان کے بجائے اسلام پر اور باطن کے بجائے ظاہر پر توجہات کا ارتکاز ہوگیا۔ قرآن پر سے توجہ کم ہونے لگی اور تعلیم وتعلم اور تدبّر وتفکر کے اصل موضوعات اب حدیث وفقہ بن گئے۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینے کی ضرورت ہے تاکہ انحراف عن القرآن کے حوالے سے ہم میں اسلاف سے سوئے ظن نہ پیدا ہو جائے۔ ایمان کے بجائے اسلام اور قرآن کے بجائے فقہ وقانون پر توجہ کسی بدنیتی کی وجہ سے نہیں ہوئی، بلکہ یہ اسلام کے سلطنت و ریاست کے دور میں داخل ہو جانے کا منطقی اور unavoidable نتیجہ تھا۔ البتہ اس میں کچھ ثانوی اسباب بھی شامل ہوئے کہ جب ہمارے ہاں دورِ ملوکیت میں دولت پرستی اور جاگیرداری آئی تو مقتدر طبقات نے شعوری طور پر کوشش کی کہ عوام کے سامنے قرآن نہ رہے۔ ؏ ''چشم مسلم سے رہے پوشیدہ یہ آئین تو خوب''۔ اس لئے کہ اگر قرآن کی اصل تعلیمات لوگوں کے سامنے آئیں گی تو وہ ہمیں اسی پیمانے پر ناپیں گے اور نتیجتاً ہم پر تنقیدی نگاہیں اٹھیں گی۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اس کتاب کو ''بند'' رکھا جائے۔ اس موضوع پر جناب یوسف سلیم چشتی موحوم کا ایک نہایت قیمتی مقالہ (قرآن حکیم سے بُعد و بیگانگی کے اسباب) ''حکمت قرآن'' (ستمبر ۹۴ء) میں شائع ہو چکا ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ ہر بدعت کسی نہ کسی سنت کی جگہ لیتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی صحیح اور مطلوب شے اپنی جگہ سے ہٹے گی تو لامحالہ کوئی غلط شے اس کی جگہ لے گی۔ چنانچہ جب ذکر کے حوالے سے قرآن حکیم مرکز ومحور نہ رہا تو اس مقصد کے لئے مختلف اقسام کے اوراد واذ کار اختیار کئے جانے لگے۔ ان اذکار کے متعلق خود اہل تصوف بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ طریقے مسنون نہیں ہیں۔ ان کا کوئی تعلق کتاب وسنت سے نہیں ہے۔ لیکن وہ دلیل یہ

اختیار کرتے ہیں کہ یہ چیزیں اجتہاد کے ذریعے اختیار کی گئیں ہیں۔ میں اس دلیل کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہوں، اس لئے کہ یہ چیزیں اجتہاد کی تعریف پر پوری نہیں اترتی ہیں، بلکہ یہ درحقیقت ایجاد و ''ابداع'' کے دائرے میں آتی ہیں۔

اس سلسلے میں دوسرا نکتہ یہ ہے کہ معاملہ صرف قرآن کی جگہ دوسرے اذکار کے اختیار کئے جانے تک محدود نہ رہا۔ بلکہ ان اذکار کی شدت اور مقدار میں بھی اضافہ کرنا پڑا۔ ظاہر ہے کہ قرآن حکیم کی غیر معمولی تاثیر اور ان اذکار کے اثرات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ذکر کیلئے کوئی بھی طریقے اختیار کر لئے جائیں، خواہ وہ مجتہدانہ ہوں یا مبتدعانہ، ان میں قرآن حکیم کی سی تاثیر تو پیدا نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ان اوراد و اذکار کی کیفیت (Quality) میں جو کمی تھی اسے کمیت و مقدار (Quantity) میں غیر معمولی اضافے کے ذریعے پورا کرنے کی کوشش کی گئی اور نہایت مشقت طلب طریقے اختیار کرنا پڑے۔ نتیجتاً قرآن پر سے توجہ مزید کم ہو گئی۔ اس طرح گویا ایک Vicious Circle وجود میں آ گیا کہ اولاً تو ایک طبعی سبب سے قرآن پر توجہ میں کمی آئی، اس کے نتیجے میں روحانی پیاس کو بجھانے کے لئے نت نئے اوراد و اذکار اختیار کئے جانے لگے، اور قرآن گویا رفتہ رفتہ اذکارِ رفتہ ہوتا چلا گیا۔

قرآن حکیم سے دوری کا جو سب سے خطرناک نتیجہ برآمد ہوا وہ یہ تھا کہ قرآن کے فلسفہ و حکمت سے بھی بُعد پیدا ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ قرآن صرف ذکر الٰہی کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ اپنے پڑھنے والوں کی ذہنی اور عقلی اعتبار سے رہنمائی بھی کرتا ہے، انسان کی فلسفیانہ پیاس کو بجھانے کا سامان بھی اسی کتاب میں ہے۔ حقیقت اور معرفت کی تلاش کے جذبے کو بھی قرآن ہی سے تسکین ملتی ہے۔ عالم اسلام میں قرآن حکیم سے دوری نے ایک فکری خلا کو جنم دیا، اور پھر یونانی فلسفہ و منطق اور نو افلاطونیت (Neo-Platonism) کے افکار کی یلغار ہوئی تو ہمارے بڑے بڑے ذہن اس سے آزاد نہ رہ سکے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ جیسی شخصیت افلاطون کے خیالات سے آزاد نہ ہو سکی تو پھر اور کس کی بات کی جائے! یہاں تک کہ ہمارے ہاں علم الاخلاق پر جو کتابیں تصنیف کی گئیں ان میں بھی یونانی حکماء ہی کی پیروی نظر

آتی ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم کے فلسفہ و حکمت سے دوری کی وجہ سے جو فکری خلاء (Intellectual Vacuum) پیدا ہوا تھا وہ انہی بیرونی فلسفوں کی مدد سے پُر کیا گیا، اور اس عمل نے ہمیں قرآن حکیم سے مزید دور کر دیا۔ یہ دوری اس معنی میں نہیں تھی کہ قرآن کو ماننا چھوڑ دیا گیا ہو، یا اسے پڑھنا ترک کر دیا گیا۔ مسلمانوں کا قرآن پر ایمان بھی رہا، اس کی تلاوت بھی ہوتی رہی، لیکن قرآن حکیم کے ذریعے اپنی ذہنی و فکری پیاس کو بجھانے کا سلسلہ ختم ہو گیا، قرآن مجید کے ذریعے اپنی روحانی ترقی کی کوشش کا معاملہ نہ رہا، قرآن سے ہماری نسبت ختم ہو گئی اور تعلق منقطع ہو گیا۔ بقول اقبال ؎

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چوں شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ

چنانچہ وعظ و نصیحت کا سلسلہ تو برقرار رہا لیکن اس میں بھی قرآن حکیم کو مرکزی حیثیت حاصل نہ رہی ؎

واعظِ دستاں زن و افسانہ بند
معنیٔ اُو پست و حرفِ اُو بلند
از خطیب و دیلمی گفتارِ اُو
با ضعیف و شاذ و مرسل کارِ اُو

یعنی واعظ کا حال یہ ہے کہ ہاتھ بھی خوب چلاتا ہے اور سماں بھی خوب باندھ دیتا ہے۔ اس کے الفاظ اگرچہ پُرشکوہ ہیں، لفاظی انتہا کی ہے، لیکن معنیٰ و مفہوم کے اعتبار سے نہایت پست اور ہلکے ہیں۔ ان میں کوئی مغز (essence) ہے ہی نہیں۔ اس کی ساری گفتگو خطیب بغدادی یا امام دیلمی سے ماخوذ ہے، اور اس کا سارا سروکار محض ضعیف، شاذ اور مرسل احادیث پر رہ گیا ہے، اور ان پر مستزاد صرف کچھ قصے کہانیاں ہیں، صوفیاء کے مبالغہ آمیز اور

جھوٹے سچے واقعات ہیں جن کی بنیاد پر سارا وعظ کہا جاتا ہے۔ یہ معاملہ تو ہمارے دور میں تبلیغی جماعت تک پہنچا ہوا ہے، جن کے ہاں فضائل کی کتابوں میں اکثر و بیشتر ضعیف احادیث ہی کی بھرمار ہے۔ اسی طرح تزکیۂ نفس کا معاملہ ہے ؎

صوفیٔ پشمینہ پوشِ حال مست
از شرابِ نغمۂ قوال مست
آتش از شعرِ عراقی در دلش
در نمی سازد بقرآں محفلش

یعنی ''اونی گدڑی پہننے والے صوفی کی محفل میں قرآن کا ذکر ہی نہیں! اس کے ساتھ اسے سازگاری اور موافقت ہی نہیں۔ ہاں قوال کے نغمے سے وہ مدہوش ہو جاتا ہے۔ عراقی کے شعر سے اس کے دل میں آگ بھر جاتی ہے۔''

الغرض قرآن سے دوری وہ پہلا قدم تھا جس کی بدولت حضور ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے سے انحراف شروع ہوا۔ ذکر تو جاری رہا لیکن اس کے ضمن میں تمام تر توجہ قرآن سے ہٹ کر دیگر اوراد و اذکار پر مرکوز ہو گئی۔ آج جو شے ''ذکر'' شمار ہوتی ہے اس کا کوئی سراغ اور اسکی کوئی سند قرآن و حدیث میں موجود نہیں اور یہ حقیقت اہل تصوف بھی تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ مولانا محمد اکرم اعوان صاحب کے مرشد مولانا اللہ یار چکڑالوی نے ''دلائل السلوک'' نامی کتاب میں مانا ہے کہ یہ طریقے مسنون نہیں ہیں، بلکہ اجتہاد کے ذریعے اختیار کیا گیا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں یہ اجتہاد نہیں بلکہ ابتداع و ایجاد ہے۔

گزشتہ نشست میں ایک نکتہ میں نے جان بوجھ کر چھوڑ دیا تھا، لیکن اب میں چاہتا ہوں کہ اسے بھی بیان کر دوں۔ میں اپنے دروس میں ہمیشہ ''ذکر'' کے چار ذرائع بیان کرتا رہا ہوں، لیکن اس مرتبہ میں نے صرف تین ہی ذرائع بیان کئے تھے، یعنی ''الذکر'' خود قرآن حکیم، پھر ذکر کی جامع ترین شکل نماز، پھر اذکارِ مسنونہ روزمرہ معمولات کے حوالے سے، یا وہ تسبیحات جو حضور ﷺ نے تلقین فرمائی ہیں۔ چوتھی چیز ہے کوئی مخصوص ذکر جو کسی خاص

شخص کیلئے تجویز کیا جائے۔ یہ دراصل معالجۂ نفس کیلئے ہوتا ہے۔ اس نکتے کو مخالفت نفس ہی کے ضمن میں شامل کر لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف لوگوں کے مختلف مزاج بنائے ہیں۔ کسی پر شہوت کا غلبہ زیادہ ہے لیکن مال و دولت کی حرص نہیں، کسی کے لئے اصل شے ہی پیسہ ہے اور کسی دوسری چیز سے اسے کوئی دلچسپی نہیں، کسی کی اصل خواہش شہرت کا حصول ہے جس کے لئے وہ سب کچھ قربان کرنے کے لئے آمادہ ہے، یا کسی کو صرف وجاہت اور اقتدار کی آرزو ہے۔ لہٰذا انسانی نفسیات کا کوئی ماہر کسی خاص شخص کے محرکات و داعیاتِ نفس کا تجزیہ کر کے تشخیص کر لیتا ہے کہ اس پر کس شے کا غلبہ زیادہ ہے اور پھر اسی تشخیص کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ اس شخص کیلئے کوئی مخصوص ذکر تجویز کرتا ہے ظاہر ہے کہ اس نوعیت کی چیزوں کو تمام لوگوں کیلئے مستقل مقام دے دینا بڑی غلطی ہوگی۔ مستقل حیثیت تو انہی چیزوں کی رہے گی جو محمد عربی ﷺ نے بتائی ہیں۔ البتہ آپ ؐ نے بھی بعض افراد کو مخصوص اذکار تلقین فرمائے ہیں جو اس چوتھی قسم میں شامل سمجھے جائیں گے۔

ii) جہاد سے دوری: سلوک محمدیؐ سے انحراف کا دوسرا سبب یہ ہوا کہ مخالفتِ نفس کی ریاضتوں کے ضمن میں دعوت و اقامتِ دین کی جدوجہد اور جہاد فی سبیل اللہ سرے سے خارج از بحث ہو گئے۔ اس کا بھی اصل سبب تو بالکل فطری اور طبعی تھا۔ یعنی جب اسلام دعوت و تحریک کے مرحلے میں تھا تو جہاد کی حیثیت فرضِ عین کی تھی۔ اس لئے کہ دعوت و تبلیغ بھی جہاد ہے، نظم کی پابندی بھی جہاد ہے، اور حق و باطل کے مابین براہ راست تصادم اور قتال کا مرحلہ آ جائے تو وہ بھی جہاد ہے۔ تاہم جب اسلام سلطنت و ریاست کے مرحلے میں داخل ہوا تو اب اس ہمہ گیر جہاد کا تصور سمٹ کر محض قتال تک محدود ہو کر رہ گیا۔ جہاد کو قتال کا ہم معنی قرار دے دیا گیا اور اس قتال کا مقصد بھی صرف مملکت کی سرحدوں کا دفاع اور اگر بس چلے تو توسیع تک محدود ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی محاذ پر ایک مخصوص تعداد میں آدمیوں کی ضرورت تھی اور اس تعداد میں آدمی نکل آئے تو گویا باقی سب کی طرف سے یہ فرض ادا ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جہاد فرضِ عین کے بجائے فرض کفایہ قرار پایا۔ یہ معاملہ تو دورِ خلافتِ

راشدہ ہی میں ہوگیا تھا اور میں نے ہمیشہ عرض کیا ہے کہ اگر دین غالب ہو تو تقرب بالنوافل کا راستہ بالکل صحیح ہے۔ آپ نفلی عبادات کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی ممکن ہو قرب حاصل کریں، یا مخالفتِ نفس کے لئے جو ایک بہت بڑی اور جامع عبادت ہے، یعنی حج، اسے اختیار کریں۔

لیکن جب خلافتِ راشدہ بھی ختم ہوگئی تو اب مسئلہ دہرا ہوگیا۔ اب ملوکیت اور جاگیرداری پر مبنی ظالمانہ نظام آ گیا۔ جس کے خلاف نظری طور پر جدوجہد ہونا چاہئے تھی، لیکن عملی طور پر دو رکاوٹوں کے باعث نہیں ہوسکی۔ پہلی رکاوٹ یہ تھی کہ بعض لوگوں کے نزدیک فاسق وفاجر مسلمان حکمرانوں کے خلاف قتال صرف اسی صورت میں ہوسکتا ہے جبکہ وہ صریح کفر کا حکم دیں۔ اس مفہوم کی بعض احادیث بھی موجود ہیں، لہٰذا ہمارے ہاں اہل حدیث مکتبہ فکر اسی موقف پر قائم ہے۔ البتہ اس معاملہ میں امام ابوحنیفہؒ نے واقعتاً مجتہدانہ بصیرت سے کام لیتے ہوئے خروج کا دروازہ کھولا ہے، لیکن انہوں نے بھی شرط اس قدر کڑی عائد کردی کہ عملاً یہ ناقابل حصول ہوگیا۔ یعنی خروج اسی صورت میں ہوسکے گا جب کہ تبدیلی لانے کیلئے ضروری قوت فراہم ہوچکی ہو۔ اس دور میں چونکہ شہری حقوق کا تصور خصوصاً اظہارِ رائے اور جماعت سازی کا حق موجود ہی نہیں تھا تو یہ مطلوبہ قوت کیسے حاصل کی جاتی؟ ایسی کسی کوشش کو تو بغاوت کی تیاری سمجھ کر ابتدائی مرحلے ہی میں کچل دیا جاتا۔ تو یہ اس معاملے کی دوسری رکاوٹ تھی۔

اس طرح حضور ﷺ کے طریقہ تزکیہ اور طریقہ سلوک میں جو عملی شعبہ تھا، یعنی جہاد فی سبیل اللہ، وہ عملی طور پر کالعدم ہوکر رہ گیا، جہاد دراصل مخالفتِ نفس کا نہایت اہم عملی ذریعہ ہے۔ اس میں ایک انسان مشقت جھیلتا ہے، تکالیف اُٹھاتا ہے، اپنی جان ومال کیلئے سو طرح کے خطرات مول لیتا ہے، مال خرچ کرتا ہے اور اس طرح مخالفتِ نفس بھی ہوتی ہے اور دوسرے پہلو سے روح کی ترقی بھی۔ دورِ ملوکیت میں تزکیۂ نفس کا بڑا شعبہ defunct ہوکر رہ گیا۔ میں مثال دیا کرتا ہوں کہ فرض کیجئے کہ ایک درخت ہے جو طبعی طور پر اوپر کی

طرف اٹھ رہا ہے لیکن اگر اس کے راستے میں چھت حائل ہوجاتی ہے تو اب وہ لامحالہ ٹیڑھا ہوجائے گا، اور کسی جانب کو مُڑ کر بڑھنا شروع ہوجائے گا کیونکہ اوپر کی سمت میں تو اس کے لئے رکاوٹ ہے۔ چنانچہ ملوکیت وہ رکاوٹ یا چھت بن گئی جسے خواہی نخواہی قبول کرنا پڑا۔ نتیجتاً دورِ ملوکیت میں جب مخالفت نفس کا یہ اہم شعبہ بند ہوا تو اس کے حصے کا سارا بوجھ بھی اوراد واذکار اور مراقبوں اور چلوں پر آ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں وہی نت نئے چلے، نت نئی ریاضتیں، سال ہا سال کی سیاحت، جنگلوں اور ویرانوں میں برسوں گزارنے کے طریقے رواج پا گئے، یہاں تک کہ اسلام میں بعینہٖ رہبانیت والا رنگ پیدا ہوگیا۔ حالانکہ حضور ﷺ نے واضح طور پر فرما دیا تھا: ”**لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ إِلَّا الْجِهَادَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ**“ اور ”**لَا سِيَاحَةَ فِي الْإِسْلَامِ إِلَّا الصَّوْم**“۔ آپ صوفیاء کے قصے پڑھ لیجئے۔ ان میں وہی چالیس چالیس سال کی ریاضتوں اور شدید قسم کی مشقتوں کا تذکرہ ملے گا۔ بہت سے صوفیوں نے تجرد کی زندگی گزاری، اس لئے کہ گھر گھرہستی کا کھکھیڑ مول لے کر ”تزکیۂ نفس“ کیسے کریں گے؟

اس معاملے کو ایک مرتبہ پھر سمجھ لیجئے کہ صدرِ اول میں اہم ترین حقیقتیں دو ہی تھیں۔ یعنی قرآن اور جہاد۔ اور ان دونوں کو link کرنے والا ”ایمان“ تھا۔ لیکن جب اسلام دعوت وتحریک کے مرحلے سے گزر کر سلطنت وریاست کے دور میں داخل ہوا تو ایک طبعی اور فطری عمل کے طور پر توجہات میں shift پیدا ہوگیا۔ ایک طرف ذکر کیلئے قرآن پر سے توجہ ہٹ گئی اور اذکار کے مختلف طریقے رائج ہونے لگے، دوسری طرف دعوت واقامتِ دین اور جہاد فی سبیل اللہ پر سے توجہ ہٹ گئی اور نہایت مشقت طلب اور غیر مسنون ریاضتیں رائج ہونے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی سارا زور نفلی عبادات پر آ گیا، اور تقرب بالفرائض کے بجائے تقرب بالنوافل کا معاملہ بڑھتا چلا گیا۔

علاج اس کا......؟

اب آیئے اس سوال کی طرف کہ علاج کیا ہو؟ جب تشخیص ہوگئی کہ سلوکِ محمدیؐ سے

انحراف کس نوعیت کا تھا اور کیونکر ہوا، تو اب علاج بھی ظاہر ہے، یعنی **اَلْعَوْدُ اِلَی الْبَدْءِ**۔ اُسی طریقے کی طرف دوبارہ رجوع کیا جائے جو ابتداء میں اختیار کیا گیا تھا۔ اسی کا نام تجدید ہے، اور اسی کو Revival اور Renaissance کہتے ہیں۔ یہ علاج بھی انحراف ہی کی طرح دو سطحوں پر کرنا ہوگا۔ اولاً رجوع الی القرآن ۔ وہ توجہ جو قرآن سے ہٹ گئی تھی اسے دوبارہ اس پر مرکوز کریں، جو معاملہ غلط رخ پر پڑ گیا تھا اسے صحیح جگہ پر لائیں، ایمان کی شدت یا گہرائی بھی قرآن سے حاصل ہوگی اور ایمان کی گیرائی اور اس کا Intellectual Element بھی قرآن ہی سے ملے گا۔ معرفت کی پیاس بھی اسی سے بجھے گی اور تلاشِ حقیقت کے جذبے کی بھی اسی سے تسکین ہوگی۔ بقول اقبال ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

اور ؎

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است
زاں کہ اُو گم اندر اعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی!
کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی!

ان اشعار میں اقبال کے فکر کی بلندی ملاحظہ کیجئے۔ میں نے اقبال کو فکرِ اسلامی کا مجدد یونہی تو نہیں مان لیا ہے!

قرآن حکیم کے متعلق ایک نکتہ اور ہے جسے ذہن نشین کر لینا چاہیے۔ کلام الٰہی کا ایک پہلو ہے اس کی تکرار، یعنی اسے پڑھتے رہو، پڑھتے رہو، پڑھتے رہو! اور دوسرا پہلو ہے اس کا فہم، تفقہ، غور و فکر، تدبر و تفہم۔ یہ دونوں پہلو ضروری ہیں، لیکن مقدار کے اعتبار سے ان کے مابین نسبت و تناسب کا معاملہ برعکس رہے گا۔ اگر تفہّم، تعقّل اور تفقہ کم ہے تو تکرارِ تلاوت اور بار بار کی repetition پر زور دینا ہوگا۔ اور اگر غور و فکر کا معاملہ بڑھ جائے تو تکرار کی کم

شدت سے بھی مطلوبہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے ”**سَنُرِیْھِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَھُمْ اَنَّہُ الْحَقُّ**“ (حم السجدة:۵۳) ”ہم انہیں عنقریب اپنی نشانیاں دکھائیں گے، آفاق میں بھی اور ان کے نفوس میں بھی، یہاں تک کہ ان پر یہ واضح ہو جائے گا کہ یہی (قرآن) الحق ہے۔“

دیکھئے قرآن استخراجی منطق (Deductive Logic) کے استدلال سے ذاتِ باری تعالیٰ کو نہیں منواتا، بلکہ استقرائی منطق (inductive Logic) کو استعمال کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اپنے چاروں طرف دیکھو، کائنات پر غور کرو، یہ تمام مظاہرِ فطرت اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہی تو ہیں۔ ع ”کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ!“

اس طرح آیاتِ ربانیہ کی تین اقسام ہو گئیں، قرآنی آیات، آفاقی آیات، اور انفسی آیات۔ ان تینوں کے مابین ہم آہنگی ہے اور ان پر غور و فکر کرنے کے نتیجے میں انسان کے اندر شعورِ خفتہ (Dormant Consciousness) ابھر کر سطح پر آجاتا ہے۔ اسی کا نام تذکر ہے، یعنی یاد دہانی حاصل کرنا۔ یہی حصول ایمان کا طریقہ ہے۔ اب ظاہر ہے کہ آج مظاہرِ فطرت کا جتنا علم اور فہم انسان کو حاصل ہو چکا ہے وہ پہلے تو نہیں تھا۔ لہٰذا سائنسی حقائق کے منکشف اور مبرہن ہونے کی وجہ سے آج فہم قرآن کے بھی نئے سے نئے راستے کھل رہے ہیں، اور **تعقّل و تفہم** قرآن کا پہلو آج بہت زیادہ اہمیت اختیار کر چکا ہے جو اُس دور میں اس انداز سے موجود نہ تھا۔ چنانچہ آج تذکر بالقرآن کی شعوری اور intellectual جہت اصل اہمیت کی حامل بن چکی ہے۔ اسی نکتے سے علامہ اقبال کے اس موقف کا تعلق جڑتا ہے جو انہوں نے اپنی ”تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ“ میں پیش کیا ہے کہ تزکیۂ نفس کیلئے صوفیاء نے جو طریقے ایجاد اور اختیار کئے تھے، آج کے انسانوں کی طبائع ان مشقت طلب اور کٹھن ریاضتوں (Rigorous Exercises) کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ ہم نے مخالفتِ نفس کی ان ریاضتوں پر اس اعتبار سے تو غور کیا تھا کہ وہ مسنون نہیں بلکہ طریقِ محمدیؐ سے انحراف و الحاد کی مظہر ہیں، اور ان غیر مسنون طریقوں کو

اس وقت اختیار کیا گیا جبکہ باطل اور نظامِ باطل کے خلاف جہاد کا دروازہ بند ہو گیا تھا، لیکن اس میں اضافی بات یہ بھی ہے کہ اس دور کے صوفیاء نے جو شدید اور کٹھن ریاضتیں تجویز کی تھیں، آج کا انسان واقعتاً ان کا متحمل نہیں ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کیلئے لامحالہ تذکر بالقرآن کی Intellectual Dimension پر زور دینا ہوگا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے علوم کے جو نئے دروازے انسان پر وا کئے ہیں اور جن کی بدولت قرآن مجید کے تفہم وتعقل وتفقہ کا معاملہ بہت آگے بڑھ گیا ہے، اس سے ان شدید مشقتوں اور ریاضتوں کی compensation ہوتی ہے۔

علاج کے ضمن میں پہلا نکتہ رجوع الی القرآن ہے، اور دوسرا یہ ہے کہ مخالفتِ نفس کیلئے دوبارہ دعوت واقامت دین کی جدوجہد کی طرف پلٹا جائے۔ عبادات میں تقرب بالفرائض پر زور ہو۔ اور صوفیاء کے دور میں نفلی عبادات پر جو over-emphasis ہو گیا تھا اس سے رجوع کیا جائے۔ اس معاملے میں بھی جو مسنون عبادات ہیں ان کی حد تک تو ہر شخص کوشش کرے، لیکن تہذیب وتزکیۂ نفس کا اصل ذریعہ جہاد فی سبیل اللہ کو بنایا جائے اور ساری محنت ومشقت دعوت واقامتِ دین کے راستے میں صرف کی جائے، میں آپ کو تجزیہ کرکے بتا چکا ہوں کہ مخالفت نفس کی ریاضتوں کے ذریعے جو مقاصد حاصل کئے جاتے تھے وہ تمام کے تمام جہاد کے راستے سے بھی پورے ہو جاتے ہیں۔ اس میں محنت ومشقت ہے جو نفس کی طلب استراحت وآرام کے خلاف ہے، اس میں انفاقِ وقت ومال ہے جو حب مال کے منافی ہے۔ آپ خطرات مول لیتے ہیں، اور دعوت آگے بڑھتی ہے تو جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آنے کا مرحلہ بھی آتا ہے اور یہ بقائے ذات اور بقائے نسل کے داعیات کی مخالفت ہے۔

دوسرے یہ بات اس اعتبار سے بھی واضح ہوگئی کہ اب غلبۂ دین کا دور نہیں ہے، اسلام اس وقت سلطنت وریاست کے دور میں نہیں ہے، بلکہ حدیث نبویؐ کی رو سے تو یہ اسلام کی غربت کا زمانہ ہے۔ بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيبًا وَسَيَعُودُ كَمَا بَدَأَ فَطُوبٰى لِلْغُرَبَاءِ۔ لہٰذا منطقی طور پر بھی یہ بات درست ہے اور معقول ومطلوب ہے کہ اب دوبارہ

جہاد فی سبیل اللہ کی طرف رجوع کیا جائے۔ اسلام کے سلطنت وریاست کے دور میں اس ضمن میں جو کمی پیدا ہوگئی تھی وہ بھی آج کے دور میں موجود نہیں ہے۔ جب دوبارہ غلبۂ دین ہو جائے گا تو پھر یہ مسئلہ بھی دوبارہ پیدا ہوگا، لیکن یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ فی الوقت دین غالب نہیں ہے اور دعوت واقامت دین کی جدوجہد اس وقت فرض عین بن چکی ہے۔ پھر یہ کہ دورِ ملوکیت میں جو رکاوٹ پیدا ہوگئی تھی وہ الحمدللہ کم از کم پاکستان میں اب تک تو نہیں ہے۔ آپ کو شہری حقوق حاصل ہیں۔ اظہارِ رائے، جماعت سازی اور اجتماع کی آزادی موجود ہے، آپ پر کوئی قانونی قدغن نہیں، کوئی ایسا قانون نہیں ہے جو اس کام میں رکاوٹ ڈالتا ہو۔ البتہ آپ نے بہت سی قدغنیں خود اپنے اوپر عائد کر رکھی ہیں۔ حب مال، حب جاہ، آسائش اور عیش کی محبت۔ اب کسی کیلئے اس کا career ہی معبود بن چکا ہے، اسے کیسے چھوڑ دے؟ کسی کے نزدیک اس کی ملازمت ہی معبود ہے، گویا اس کے خیال کے مطابق اللہ تعالیٰ کی رزاقیت اسی ملازمت کے ذریعے سے پوری ہوسکتی ہے، کسی اور ذریعے سے پوری ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ سب وہ رکاوٹیں ہیں جو آپ نے خود اختیار کر رکھی ہیں۔ ان کی ذمہ داری آپ پر ہے۔ خارجی طور پر کوئی رکاوٹ موجود نہیں ہے۔ آپ جتنا ایثار کر سکتے ہیں کریں، جس قدر آگے بڑھ سکتے ہیں بڑھیں، اس جدوجہد میں آپ جتنا گڑ ڈالیں گے اتنا ہی میٹھا ہوگا۔ This depends entirely upon you...... آپ جتنی قربانی دیں گے اتنا ہی اپنی روحانی ترقی کا راستہ کھولیں گے۔ جتنی نفس کی مخالفت کریں گے۔ اتنی ہی ارتقائے روحانی کی منازل طے ہوں گی۔ اب وہ معاملہ تو نہیں ہے کہ کوئی ذرا سی بات کرتا تو باغی اور گردن زدنی شمار ہو جاتا تھا۔ حضرت حسینؓ کو اس لئے باغی سمجھا گیا کہ اُس وقت بیعت لے کر جنگ کرنے کے سوا کوئی اور دوسرا راستہ تھا ہی نہیں۔ حضور ﷺ کیلئے اللہ تعالیٰ نے خصوصی طور پر اس جہاد کے ضمن میں سازگار حالات پیدا فرما دیئے تھے، جنہیں میں نے حال ہی میں اپنی تقاریر میں واضح کیا ہے۔ جزیرہ نمائے عرب میں ایک مرکزی حکومت کا نہ ہونا درحقیقت حضور ﷺ کے لئے بہت بڑی سہولت تھی۔ دوسرے اس وقت کی سپر پاورز یعنی روم اور ایران کا غافل رہنا، کہ انہیں پتا ہی نہیں چلا کہ ان کی جڑیں کٹ رہی ہیں۔

ان عوامل کی بدولت حضور ﷺ کو Breathing Space ملی۔ آپ کے علم میں ہے کہ حکومت نام کی کوئی شے اگر تھی تو کسی درجے میں مکہ میں تھی، اور اسی لئے حضور ﷺ کو بالآخر وہاں سے نکلنا پڑا۔ اس حوالے سے پاکستان میں وہ رکاوٹیں موجود نہیں ہیں۔ یہ درست ہے کہ نظام باطل کے پاسبانوں کے پاس ہر نوع کے وسائل ہیں، وہ آپ کی کردار کشی (Character Assasination) کر سکتے ہیں، بڑے سے بڑے قلمکاروں کو اس مقصد کیلئے خرید سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ سب تو ہوگا، لیکن قانونی و آئینی اعتبار سے نہ آپ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، نہ ع ''بول! کہ لب آزاد ہیں تیرے!'' کے مصداق آپ کی زبان ہی پر کوئی تالے ڈال دیئے گئے ہیں!

اب اس بحث کو سمیٹ لیں! دیکھئے تزکیۂ نفس اور تصوف کے حوالے سے بھی سارا تجزیہ اور ساری تشخیص اسی نکتے پر آ گئی یعنی دعوت و اقامتِ دین کی جدوجہد۔ اصل کام وہی ہے جو ہم کر رہے ہیں۔ ع ''آئی صدائے جبرئیلؑ تیرا مقام ہے یہی!'' یہاں میں اس آیۂ مبارکہ کا حوالہ دوں گا کہ ''قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۔ الحمد للہ کہ جہاں تک فکر اور سوچ کا تعلق ہے تو یہ سارا تانا بانا اور صغریٰ کبریٰ اس کام کے شروع کرنے سے پہلے ہی میرے ذہن میں مکمل تھا۔ اس کی گواہی کیلئے میرے کتابچوں ''اسلام کی نشأۃِ ثانیہ'' اور ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' کا مطالعہ کر لیجئے، یا ''حقیقتِ زندگی'' نامی مضمون دیکھ لیجئے جو ۱۹۶۶ء میں لکھا تھا، یا ''اسلام میں عقل و نقل کی کشمکش'' نامی تحریر ملاحظہ کر لیجئے جو ۱۹۶۸ء میں لکھی گئی تھی۔ اب میں اسی آیت کو ایک ''دعویٰ'' کی صورت میں تبدیل کر کے پڑھ رہا ہوں: هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ، سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَلَا مِنَ الْمُبْتَدِعِيْنَ ۔ اللہ پاک ہے، میں نہ مشرکوں میں سے ہوں اور نہ مبتدعین میں سے۔ اگرچہ
''ایں سعادت بزورِ بازو نیست۔ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!''

جہاں تک مقاصد کا تعلق ہے تو اہل تصوف کے مقاصد کو میں صد فیصد دین سمجھتا ہوں۔ میں نے آپ کو مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کا قول سنایا تھا کہ اسلام کے اصل

فلسفی صوفیاء ہی ہیں۔ لہٰذا اس پہلو کو بھی ذہن میں رکھئے کہ میری سوچ میں یہ عنصر بھی ہے خواہ وہ فلسفہ وجود کے حوالے سے ہو یا حقیقت زندگی اور حقیقت انسان کے حوالے سے لیکن میرا اصل مبدء اور منبع، میرا اوڑھنا بچھونا، میری سوچ کا ماخذ اور source، درحقیقت قرآن حکیم ہی ہے، میری سوچ میں عقل و منطق یا قیاس کے حوالے سے جو اضافے ہیں وہ الگ رہیں گے، لیکن اس کا اصل تانا بانا قرآن مجید کے محکمات پر قائم ہے۔ اس میں تصوف کا فلسفیانہ حصہ بھی شامل ہے، لیکن جہاں تک تصوف کے عملی پہلو کا تعلق ہے تو اس کے متعلق تفصیل آپ کے سامنے آ گئی کہ اس کی اساس کیا تھی، کس طرح انحراف ہوا، اور کیوں ہوا۔ اس حوالے سے میں نے آپ کے سامنے اپنا موقف رکھ دیا ہے۔ اگر اس میں کوئی خیر ہے تو منجانب اللہ ہے، یا پھر آپ لوگوں کا حسن نظر ہے۔ اور اگر کوئی شر ہے، خطا یا غلطی ہے تو میں خود بھی اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتا ہوں، اور آپ کے لئے بھی دعا گو ہوں کہ وہ اسے آپ کے حافظے سے محو کر دے۔

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے!
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے!!

مقاماتِ تصوف کے بعض پہلو آج کی گفتگو میں زیرِ بحث نہیں آئے، جیسے مقامِ صبر، مقامِ رضا، مقامِ توکل، لیکن یہ تمام موضوعات سورۂ تغابن کے درس میں موجود ہیں۔

اقول قولی هذا و استغفرالله لی ولکم و لسائر المسلمین والمسلمات

☆—☆—☆

مرکزی **انجمن خُدّامُ القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ......اور...... سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم وحِکمت** کی

وسیع پیمانے......اور......اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر واشاعت ہے

تاکہ امتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہوجائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ -اور- غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہوسکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ

تنظیمِ اسلامی کا پیغام نظامِ خلافت کا قیام

تنظیمِ اسلامی

مروجہ مفہوم کے اعتبار سے

نہ کوئی سیاسی جماعت نہ مذہبی فرقہ

بلکہ ایک اصولی

اسلامی انقلابی جماعت

ہے جو اولاً پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں

دینِ حق

یعنی اسلام کو غالب یا بالفاظ دیگر

نظامِ خلافت

کو قائم کرنے کیلئے کوشاں ہے!

امیر: **حافظ عاکف سعید**